عابد سہیل

کھلی کتاب

(خاکے)

عابد سہیل

کتاب کا نام	:	کھلی کتاب
مصنف	:	عابد سہیل
اشاعت	:	پہلا ایڈیشن جولائی ۲۰۰۴ء
تعداد	:	پانچ سو (۵۰۰)
طباعت	:	کاکوری پریس۔ لکھنؤ
کمپوزنگ	:	یونک کمپیوٹر سنٹر، ندوہ روڈ، لکھنؤ۔ فون: 2740598
قیمت	:	۱۶۰ روپے

ملنے کا پتہ

عابد سہیل

۲۲۔ایس پی، چیتن وہار

سیکٹر سی۔ علی گنج

لکھنؤ۔۲۴

NAME OF BOOK	:	**Khuli Kitab**
AUTHOR	:	Abid Suhail
Number of Copies	:	500
Publisher	:	Abid Suhail
PRINTING PRESS	:	Kakori Press, Lucknow
PRICE	:	Rs. 160/-

Abid Suahail

22 , S.P., Chetan Vihar

Sector C- Aliganj,

Lucknow - 226 024

Ph:2329860

ابّا

کی آخری آرام گاہ

کے

قدموں میں

''رکھ کے دِل روٹی کے ٹکڑے پر وہ دیتا تھا مجھے''

مصنف کا نام	:	سیّد محمد عابد
قلمی نام	:	عابد سہیل
پیدائش	:	۱۷/نومبر ۱۹۳۲ء
وطن	:	اورئی۔ ضلع جالون (اتر پردیش)
تعلیم	:	ایم۔اے (فلسفہ)
پتہ	:	۱۲۲ ایس۔ پی، چیتن وہار
		سیکٹر 'سی'۔ علی گنج
		لکھنؤ۔226024

فہرست

پیش لفظ

۷

۱۔ ڈاکٹر عبدالعلیم

۱۳

۲۔ حیات اللہ انصاری

۲۳

۳۔ ایم چلپت راؤ (ایم۔سی)

۳۵

۴۔ آل احمد سرور

۶۷

۵۔ پنڈت آنند نرائن ملاؔ

۸۲

۶۔ عشرت علی صدیقی

۹۱

۷۔ عابد پیشاوری

۱۰۷

۸۔ وجاہت علی سندیلوی

۱۲۱

۹۔ منظر سلیم

۱۳۲

۱۰۔ احمد جمال پاشا

۱۴۱

۱۱۔ مقبول احمد لاری

۱۵۵

۱۲۔ ڈاکٹر عبدالحلیم

۱۷۱

۱۳۔ راجیش شرما

۱۷۹

۱۴۔ نسیم انہونوی

۱۸۷

۱۵۔ اُولڈ انڈیا کافی ہاؤس

۱۹۳

پیش لفظ

یہ خاکے کسی منصوبے کے تحت نہیں لکھے گئے تھے۔ان میں سے پہلا خاکہ ڈاکٹر عبدالعلیم کے انتقال کے چند دن بعد تقریباً قلم برداشتہ لکھا گیا تھا اور ''ہماری زبان'' کے اس شمارے میں شائع ہوا تھا جس میں سارے ہی مضامین مرحوم کی شخصیت اور کارناموں سے متعلق تھے۔ بعد میں یہ خاکہ متعدد رسائل اور اخبارات میں شائع ہوا۔ یہ بھی فرمائش کی گئی کہ ایسا ہی ایک اور مضمون مرحوم کے بارے میں لکھ دوں۔ ظاہر ہے یہ ممکن نہ تھا۔

خاکہ نگاری ایک بار شروع ہوئی تو یہ سلسلہ چل نکلا لیکن رفتار خاصی سست رہی۔ ایک دن یکا یک احساس ہوا کہ ان کی تعداد اتنی ہو گئی ہے کہ اب انھیں کتابی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ''کھلی کتاب'' حاضر ہے۔

ہر شخصیت دوسری شخصیت سے مختلف ہوتی ہے اور اسی طرح اس کی جانب دوسروں کا رویّہ بھی، دیکھنے کا انداز بھی۔ خاکہ نگار بھی ان ''دوسروں'' ہی میں ہوتا ہے۔ چنانچہ خاکہ نگاری میں دو شخصیتوں کے درمیان معاملہ ہر خاکہ کو اپنے رنگ و آہنگ میں دوسرے خاکے سے مختلف بنا دیتا ہے اور کسی متعین معیار پر اس کا پورا اترنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔

شاید اسی سبب سے افسانہ کی طرح خاکہ کی معیار بندی مشکل ہے۔ تاہم کوئی نہ کوئی معیار تو ہوگا ہی جس کی بنیاد پر اسے دوسرے اصناف سخن سے ممیز کرنے کے علاوہ اس کی شناخت یا خوبی اور خامی کا پیانہ قرار دیا جا سکتا ہو۔ کسی شخصیت کا ممکن حد تک مکمل عکس کی پیش کرنے کی کوشش تو خیر سامنے کی بات ہے، سوال یہ ہے کہ اس کے علاوہ وہ دوسرے عناصر کیا ہیں جن کی موجودگی کسی تحریر کو خاکہ گردانئے کے لیے ضروری ہے۔ شاید ان کی نشاندہی کے مقابلے میں یہ کہنا آسان ہے کہ خاکے میں کیا نہیں ہونا چاہیے۔

اس سلسلے میں ایک بات یہ ہے کہ خاکہ نگار کو ''مانگے کے اجالے'' میں خود کو منوّر کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے اور اس کے لیے اپنی نام نہاد ہمہ دانی اور خوبیوں کے اظہار سے اجتناب برتنا ضروری ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مصنف کے علم اور تجربہ کی بنیاد پر کوئی شخصیت خاکہ نگار کو ''فرشتوں جیسی'' معلوم ہوتی ہو تو اس کے اظہار میں صرف اس لیے بخل برتنا کہ اسے غلط سمجھا جا سکتا ہے، شاید مناسب نہیں۔ لیکن کمزوریوں کے بیان میں کسی قدر احتیاط ضروری ہے، کیوں کہ اوّل تو یہ کہ شک کے فائدے سے کسی کو محروم رکھنا ہرگز مناسب نہیں اور دوسرے یہ کہ شاید عیبوں کی کھتونی پر قلم کی روشنائی صرف کرنے کا مشکل ہی سے کوئی جواز پیش کیا جا سکے۔

خاکہ نگاری میں ایک دقت یہ پیش آتی ہے کہ ہر شخصیت اپنی زندگی کے ایک بڑے حصّے میں نمو پذیر ہونے کے علاوہ مائل بہ زوال بھی ہوتی ہے یعنی عروج و زوال کا کھیل ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے اور یہ ڈر بھی لگا رہتا ہے کہ خاکہ شائع ہوتے ہوتے یا دو چار برس کے اندر شخصیت کا کوئی پہلو اس طرح نہ چھا جائے کہ پوری تحریر دفترِ بے معنی معلوم ہونے لگے اور چونکہ سب کچھ پیش کرنا ممکن نہیں ہوتا اس لیے یہ خطرہ بھی رہتا ہے کہ تحریر عدم توازن کی شکار نہ ہو جائے۔ اپنی شخصیت کے سارے پہلوؤں کو کوئی خود بھی پیش نہیں کر سکتا، بھلا دوسرا کیا خاک کرے گا۔

یوں تو ہر ادبی کاوش انتخاب کا عمل ہوتی ہے، کہیں الفاظ کا انتخاب کرنا ہوتا ہے کہیں کردار کا، کہیں دلیل کا اور کہیں واقعہ کا۔ لیکن خاکہ نگاری میں یہ مشکل شدید تر ہو جاتی ہے، کیوں

کہ خاکہ نگار کے ''ممدوح'' کی شخصیت کے بارے میں دوسرے بھی کوئی نہ کوئی رائے رکھتے ہوں گے جو اُنہوں نے اُسے جانچنے، پرکھنے، آنکنے اور برتنے کے بعد قائم کی ہوگی۔ خاکہ میں کسی شخصیت کے بارے میں ظاہر کی جانے یا منعکس ہونے والی رائے کو عام رائے سے سراسر متغائر ہونے سے بچانے کے ساتھ معروضیت کا دامن تھامے رہنا بھی ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے اور یہ بھی کہ وہ جو ''ہیں'' سے ''تھے'' ہو چکے ہیں، ان کی زندگی کے کمزور پہلوؤں پر سے پردے اُٹھانا، کچھ ایسا کارِ نیک نہیں۔ اخلاقی قدریں بھی جگہ جگہ دامن پکڑتی ہیں۔ اکثر صورتوں میں انسان کا اپنے ساتھ مروّت برتنا آسان ہوتا ہے اور بے مروّتی سے کام لینا بھی۔ پڑھنے والے زیادہ سے زیادہ یہی تو کہیں گے کہ موصوف خود کو صاف بچا لے گئے یا یہ کہ خود اپنے بارے میں ان کی رائے کچھ اچھی نہ تھی، ورنہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ لیکن دوسروں کے سلسلے میں مروّت برتی جائے یا بے مروّتی سے کام لیا جائے، نیت پر شک وشبہ کا اظہار یقیناً کیا جائے گا۔

خاکہ نگاری میں کبھی کبھی ایک پریشانی کچھ اس قسم کی پیش آتی ہے جس کا سامنا ڈاکٹر نورالحسن نقوی کو ذاکر صاحب کے سلسلے میں کرنا پڑا اور وہ ''اُجالوں کی اس تصویر'' کو اِن الفاظ کے ساتھ ختم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ''مگر بہار کی گورنری، ہندوستان کے نائب صدر اور صدر کے منصب اُن کے انتظار میں تھے۔ بے شک ان اعلیٰ مناصب پر رہ کر اُنہوں نے علم و ادب کی ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں مگر جس ذاکر حسین کے ہم پرستار ہیں اس کی زندگی کا خاتمہ علی گڑھ میں ۱۹۵۶ء میں ہو گیا۔ اس لیے ۱۹۵۶ء کے بعد کی زندگی پر قلم اُٹھائے بغیر ہم اس مضمون کو یہیں ختم کرتے ہیں''۔ ذاکر صاحب کی زندگی کے آخری دور کے بارے میں کچھ نہ کہہ کر نقوی صاحب نے چند جملوں میں اتنا کچھ کہہ دیا ہے جو صفحات کے صفحات سیاہ کرنے کے بعد بھی مشکل ہی سے کہا جا سکتا۔ کوئی بتلائے کہ اس مشکل کا حل اس کے سوا کیا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کو خود ہی توڑ کر خوابوں کو بکھر جانے دیا جائے۔

یہ ساری باتیں اس وقت جب یہ خاکے لکھے گئے ذہن میں نہ تھیں اور ہوتیں بھی تو کیا ضرور تھا کہ ان پر عمل کرنا بھی ممکن ہوتا۔ بقراطیت جھاڑنا آسان ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ اکثر صورتوں میں آخر میں کہنا یہی پڑتا ہے ''من نہ کردم شما حذر بکنید''

ایک دن ''قومی آواز'' کے دفتر میں کسی نے کہا A man is remembered by his weaknesses (انسان اپنی کمزوریوں سے ہی یاد رکھا جاتا ہے)۔ میں نے کسی قدر ملال کے ساتھ اور اس مقولہ سے اتفاق نہ کرتے ہوئے زیر لب کہا ''یہی تو المیہ ہے''۔ محمد حسن قدوائی مرحوم نے جن کے پاس کی کرسی پر میں بیٹھا ہوا تھا میرا یہ فقرہ سن لیا اور مجھ سے کہا ''سچی بات تو وہی ہے جو اس مقولہ میں کہی گئی ہے لیکن اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ زندگی کے تجربات و حوادث اس کی سچائی خود ہی آشکارا کر دیں گے''۔ اور جب زندگی نے بہت کچھ آئینہ کر دیا تو ایک دن احساس ہوا کہ ان چند الفاظ میں بصیرت کا کتنا سامان موجود ہے۔ شخصیت کی تعمیر میں انسانی کمزوریوں کا عمل دخل خوبیوں سے شائد کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ کسی بھی شخصیت کی کمزوریوں کو پسِ پشت ڈال دیجیے، ساری عمارت بکھر جائے گی، جیسے بھربھری مٹی کی بنی ہو۔ لیکن اس حقیقت کو چن چن کر برائیاں پیش کرنے کے جواز کے طور پر استعمال کرنا مناسب نہ ہوگا۔

غالب نے ''دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا'' کہا تو کواکب کے لیے تھا لیکن شخصیات کواکب ہی تو ہیں ــــ درخشاں، روشن، کم روشن اور بس جھلملاتے ہوئے اور ایسے بھی کہ ہزار پردے اُٹھانے کے بعد اُن کی بس ایک جھلک نظر آتی ہے۔ کم و بیش سو سال بعد ''غالب شکن'' والے یگانہ نے، جو اُن سے اِس لیے خفا تھے کہ اُن کی شعری وراثت کے ایسے ایسے دعویدار پیدا ہو گئے تھے جن کی غالب فہمی ہی مشکوک تھی، یہی بات معکوس انداز میں کہی تھی۔ ''جیسی جس کے گمان میں آئی''۔ یہاں وہ آشکارا اگرچہ عقل کی نارسائی کرنا چاہتے تھے لیکن کواکب دھوکا دیں یا عقل حقیقت پرے سے بس اس قدر پردہ اٹھائے کہ اُسے زیادہ سے زیادہ گمان قرار دیا جا سکے، مسئلہ ترسیل و ابلاغ ہی کا رہتا ہے کہ کیا اور کتنا کہا جا سکا اور کیا اور کتنا گرفت

میں آنا ممکن ہوا۔ یوں تو سارا ادب ہی اس سوال کے حصار میں آ جاتا ہے لیکن خاکہ نگاری چوں کہ جیتی جاگتی شخصیت اور مصنف کے درمیان کشمکش کی بھی ایک صورت ہے اس لیے یہاں دونوں مصرعے بلکہ دونوں اشعار پوری طرح صادق آتے ہیں۔

یادش بخیر حضرت گنج کے ''اُولڈ انڈیا کافی ہاؤس'' کی بھی اپنی ایک شخصیت تھی۔۔۔۔ خاموش، پرسکون۔۔۔۔ لیکن سیاست، صحافت اور فنون لطیفہ کے میدانوں میں زمین و آسمان اوپر تلے کرنے والوں کی آماجگاہ۔ اس سے اپنے عہد کی بہت بڑی شخصیتیں متعلق تھیں اور بہت سوں کو اُس نے ان دیوقامت شخصیتوں کے فیض سے ہی اپنی پہچان بھی دی تھی۔ خاکوں کے اس مجموعے میں ''اُولڈ انڈیا کافی ہاؤس'' پر مضمون کی شمولیت کا یہی جواز ہے۔

خود میری شخصیت کی ترتیب و تشکیل میں اس کافی ہاؤس کا بڑا ہاتھ رہا ہے، اگرچہ اس کے باوجود میں سڑک کا روڑا ہی بن سکا، لیکن اس سڑک کا جسے بڑی شخصیتوں اور ان کی یادوں نے منوّر کر رکھا ہے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم

غازی پور کا مردم خیز موضع پہتیا............... مئی ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتہ کے کسی دن کی صبح۔

عبدالماجد صدیقی جو بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ کمیسٹری میں پروفیسر ہوئے، لکھنؤ آرٹس کالج کے سابق پرنسپل اور مشہور آرٹسٹ بشٹ کے کلاس فیلو عارف صدیقی، طفیل بھائی اور مدنی بھائی اور عابد سہیل باہر کے کمرے میں جہاں علیم صاحب فراگ چیئر پر دراز ہیں اور کل کا اخبار، جو رات گئے آیا ہے، پڑھ رہے ہیں، نوجوان چند دوسرے نوجوانوں کا اور محسن الملک کے سکریٹری اور مدرستہ العلوم کے سابق پروفیسر ابوالحسن صاحب اور حمید اللہ صاحب چند بزرگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔

پہلے نوجوانوں کی ٹیم پوری ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد خاندان اور گاؤں کے کچھ اور بزرگ بھی آ گئے اور سامنے والے تالاب سے ملحق میدان میں میچ شروع ہو گیا۔ بزرگوں کی ٹیم کی پالی پہلے شروع ہوئی۔ میں گلی لوکنے کے لیے تیزی سے آگے بڑھا تو علیم صاحب نے کہا۔ ''دیکھ کے ....گرنا نہیں''

میں نے گلی لوک تو لی لیکن خوشی کا نعرہ لگانے کے بجائے علیم صاحب کو دیکھنے لگا۔ ایسا

لگا جیسے چند ماہ قبل والد کے انتقال کے بعد باپ کی آواز پہلی بار کانوں میں پڑی ہو۔ وہی شہد میں لپٹی محبت، وہی خلوص، وہی، وہی............

اس وقت میں نویں درجہ کا طالب علم تھا۔ گرمیوں کی تعطیل کے بعد اورئی (ضلع جالون) لوٹا تو ایک یاد بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔ دہرا بدن، گورا چٹا رنگ، ذرا سی خوشی یا نا گواری میں کان کی لَووں تک سرخ ہو جانے والا چہرہ، فرنچ کٹ داڑھی، شیروانی، چوڑی مہری کا پاجامہ اور سگار۔

اور سگار تو علیم صاحب کی پہچان بن گیا۔

ایک صاحب نے پوچھا "علیم صاحب آپ دن بھر میں کتنے سگار پی لیتے ہوں گے؟"

"تین یا چار"

"لیکن میں نے تو جب بھی آپ کو دیکھا سگار پیتے ہی دیکھا"

"آپ کو دیکھ کر جلا لیتا ہوں" علیم صاحب نے مختصراً جواب دیا اور محفل قہقہہ زار بن گئی۔

ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد کرسچین کالج میں داخلہ لیا۔ نہ جانے کیسے ملاقات مجید پرویز اور برجموہن ناتھ کاچرو سے ہو گئی۔ یہ دونوں ایک شام ایک ادبی نشست میں لے گئے۔ وہاں علیم صاحب بھی موجود تھے۔ میں انہیں دیکھ کر ایک کونے میں کھسک گیا۔ سرور صاحب کے بیرو روڈ کے مکان کے اس جلسہ میں احتشام صاحب، سلام مچھلی شہری، شوکت صدیقی، رضا انصاری، ڈاکٹر رشید جہاں، مظہر حسین اور کمال احمد صدیقی خوب اچھی طرح یاد ہیں۔

مجھے دیکھ کر علیم صاحب نے شوکت صدیقی سے پوچھا

"شاعری کرتے ہیں؟"

"افسانے لکھتے ہیں"

"خدا کا شکر ہے"

بہت دنوں بعد مَیں نوجوانوں کی ٹولی کے ساتھ پہلی بار کافی ہاؤس گیا۔

ابھی کافی کی تندی نے منہ میں مٹھاس گھولی بھی نہ تھی کہ بائیں جانب کی میز پر نظر پڑی۔ وہاں علیم صاحب بیٹھے تھے، پروفیسر کالی پرشاد، پروفیسر ڈی۔ پی۔ مکھرجی اور یشپال جی کے ساتھ۔ان تینوں کو جانا میں نے بعد میں۔

اگلے روز کرسچین کالج میں ایک تقریری مقابلہ تھا جس میں مجھے بھی حصّہ لینا تھا۔ججوں کے پینل میں ڈاکٹر ہینسن (پرنسپل) اور ڈاکٹر چافن کے علاوہ علیم صاحب بھی تھے۔۔۔۔گھر میں علیم صاحب، کالج کے تقریری مقابلہ میں علیم صاحب، ترقی پسند مصنفوں کے جلسہ میں علیم صاحب۔ میں ایک دم بچہ سے بڑا ہو گیا۔

نومبر یا دسمبر ۱۹۴۹ء کی ایک شام۔علیم صاحب حضرت گنج میں یونیورسل بک ڈپو کے سامنے سڑک کی دوسری جانب فٹ پاتھ پر چند لوگوں کے ساتھ دھیرے دھیرے مے فیئر کی طرف جا رہے ہیں۔ یکایک بالکل قریب آ کر ایک لمبی سرکاری گاڑی رک گئی، اور سروجنی نائڈو، جو اُن کو بیٹا کہتی تھیں، کار کا دروازہ کھول کر باہر آ گئیں۔ کئی ریاستی وزرا جن میں حافظ ابراہیم بھی شامل تھے اپنی اپنی کاروں سے نکل کر باہر آ گئے۔ حافظ جی اور علیم صاحب ۱۹۴۲ء میں شائد ایک ساتھ جیل میں رہ چکے تھے اور یہ ۱۹۴۹ء ہے جب کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیاں ایک دوسرے کو ترچھی نظروں سے دیکھ رہی ہیں اور بیشتر کمیونسٹ یا تو جیلوں میں ہیں یا انڈر گراونڈ۔

حافظ ابراہیم نے کہا ”علیم صاحب اب تو آپ سے ملاقات ہی نہیں ہوتی؟“

”ملاقات کی جو جگہ تھی وہاں آپ نے جانا ہی چھوڑ دیا“ علیم صاحب نے جواب دیا اور سروجنی نائڈو اور باقی لوگ قہقہہ مار کر ہنس دیے۔

کافی ہاؤس علیم صاحب روزانہ آتے ہیں۔ آندھی آئے، پانی آئے-کافی ہاؤس میں آنے کا ناغہ نہیں ہو سکتا۔۔۔موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ مجید پرویز، شوکت صدیقی سے کہتے ہیں۔

"علیم صاحب آج کیسے آئیں گے؟"

"کچھ بھی ہو آئیں گے ضرور!"

"ناممکن"

"شرط !"

"شرط"

"دس دس روپے"

"دس دس روپے"

پانی یوں ہی برستا رہا۔ لیکن مجید پرویز شرط ہار گئے۔

کافی ہاؤس میں کسی نے کہا۔"علیم صاحب علی گڑھ جا رہے ہیں، شعبۂ عربی میں۔
مجاز نے اپنے مخصوص لہجے میں پوچھا۔
"علیم صاحب علی گڑھ میں کافی ہاؤس ہے؟"
"ہے"۔علیم صاحب نے جواب دیا۔

یونیورسٹی کورٹ نے وائس چانسلر شپ کے لیے تین نام بھیجے ہیں۔ علیم صاحب کا نام تیسرا ہے۔ دہلی میں گھوڑے دوڑ رہے ہیں۔ علیم صاحب علی گڑھ میں ہیں۔
وائس چانسلر شپ کا فیصلہ ہونے والا ہے۔
علیم صاحب علی گڑھ میں ہیں۔
کوئی مشورہ دیتا ہے۔"ارے دہلی جایئے، کچھ بات کیجیے"
"کیا بات کروں...... کہوں مجھے وائس چانسلر بنا دیجیے"
اسی دوران فلسطین کے مطالبے کی حمایت میں ایک بین الاقوامی کانفرنس ہوئی۔ علیم

صاحب کو دہلی جانا پڑا۔ صبح کا اجلاس ختم ہوا۔ علیم صاحب کانفرنس ہال سے باہر نکل رہے ہیں۔ اُس وقت کے مرکزی وزیر تعلیم نے کسی سے پوچھا۔ ''یہی ڈاکٹر علیم ہیں؟''

جب علیم صاحب پاس سے گذرے تو اُن لوگوں میں سے جو وزیر تعلیم کو گھیرے کھڑے تھے کسی نے علیم صاحب کو روک کر وزیر باتدبیر سے متعارف کرا دیا۔

وزیر تعلیم نے اپنے مخصوص بنگالی لہجے میں کہا ''علیم ......لوگ کہتا ہے تم کمیونسٹ ہو!''

علیم صاحب نے سگار مونہہ سے نکالا اور جواب دیا۔

''لوگ ٹھیک کہتا ہے''

علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری کا فیصلہ ہو گیا۔

ایک نیم مذہبی، نیم سیاسی جماعت کے سہ روزہ اخبار کا نمائندہ علیم صاحب سے انٹرویو لینے آیا ہے۔ انٹرویو کو اپنے منصوبے کے مطابق موڑنا چاہتا ہے لیکن اُن کے علم، اُن کی شخصیت، اُن کے خلوص، اُن کی دردمندی اور اُن کے تحمل کے سامنے خود کو بے دست و پا پاتا ہے تو اپنے ترکش کا آخری تیر چلا دیتا ہے۔

''مذہب کے بارے میں آپ کے عقائد کیا ہیں؟''

''مجھے میرے عقائد کے بجائے میرے عمل سے جانچیے''

علیم صاحب نے اسے یہ بھی نہیں بتایا کہ اُنہوں نے ولہوزن کے اعتراضات کے جواب میں سیرت نبویؐ پر ایک کتاب لکھی ہے، اُنہوں نے اسے یہ بھی نہیں بتایا کہ اُن کی عربی دانی اور اُن کے کام کو جامعہ ازہر تک میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

یونیورسٹی کی فضا درہم برہم ہے۔ طلبہ نے رات گیارہ بجے کے قریب وی۔ سی ہاؤس کو گھیر رکھا ہے۔ گھر کے لوگ، حفاظتی عملہ اور یونیورسٹی کے سینئر اساتذہ علیم صاحب کو سمجھا رہے ہیں

کہ اس وقت باہر نکل کر طلبہ سے ملاقات کرنا مصلحت کے خلاف ہے۔ لیکن علیم صاحب بضد ہیں۔ آخر میں دربان ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ علیم صاحب نہایت نرم لیکن مضبوط ہاتھوں سے اس کا ہاتھ نیچے کرتے ہیں اور دروازہ کھول کر باہر نکل جاتے ہیں، اور طلبہ کی بات سنتے ہیں۔ سینئر اساتذہ مداخلت کرنا چاہتے ہیں تو انہیں روک دیتے ہیں۔ ''یہ میرا اور میرے بچّوں کا معاملہ ہے''

علیم صاحب کتنی زبانوں پر حاوی تھے، یہ راز کبھی کھل نہ سکا۔ سنسکرت کی انہیں شد بد تھی، ہندی وہ جانتے تھے، انگریزی، اُردو، جرمن، فارسی، فرنچ، چینی، عربی اور روسی زبانوں پر ان کی قدرت کا عام طور پر لوگوں کو علم تھا۔۔۔۔ علی گڑھ میں تاجکستان کے ایک وفد کے اعزاز میں ایک بڑا جلسہ ہوا جس کی صدارت علیم صاحب نے کی۔ خاتون مترجم کو وفد کے ایک رکن کی تقریر کا ترجمہ کرنے میں دقّت ہوئی تو علیم صاحب نے اُنگلی پکڑ کر اسے بٹھا دیا اور خود کھڑے ہو گئے۔ اس دن لوگوں کو معلوم ہوا کہ علیم صاحب تاجک بھی جانتے ہیں۔

''ماہنامہ کتاب'' نے ممتاز ادیبوں کے انٹرویو چھاپنا شروع کیے تو میری درخواست پر خلیل الرحمٰن اعظمی، وحید اختر اور شہریار نے علیم صاحب سے انٹرویو لیا۔ خلیل صاحب نے مجھے لکھا کہ انٹرویو لکھ کر علیم صاحب کو دے دیا ہے آپ ان سے منگا لیجیے۔ میں نے علیم صاحب کو ہر چوتھے پانچویں دن ایک خط لکھنا شروع کیا اور آخر میں تار بھیجا۔ تقریباً چار ماہ بعد انٹرویو موصول ہوا۔ سادی ڈاک سے۔ اس کے ساتھ ہی ایک مختصر سا خط[1] بھی تھا۔

۲۴/اپریل ۱۹۶۷ء

عزیزی عابد

تمہارا تار ملا۔ بات چیت کی روداد بھیج رہا ہوں، اس میں کچھ تاخیر تو وحید اختر صاحب نے کی اور اس کے بعد مجھے نظرِ ثانی کرنے کی فرصت نہیں ملی۔

---

[1] ۱۹۷۶ء میں علیم صاحب کے انتقال کے فوراً بعد یہ مضمون لکھتے وقت اصل خط میرے پیش نظر نہ تھا۔

پہلا حصہ میری رائے میں زیادہ طویل ہو گیا ہے۔ وحید اختر صاحب کا اصرار ہے کہ اس کو مختصر نہ کیا جائے۔ اس کو تمہاری صوابدید پر چھوڑتا ہوں۔

میرا ارادہ ۲ مئی کو لکھنؤ پہنچنے کا ہے اور اسی روز واپسی کا قصد ہے۔ صبح ۹ بجے صمدی صاحب[۱] کے گھر پر آ جاؤ یا ٹیلیفون سے گفتگو کر لو تو پروگرام معلوم ہو جائے گا۔

امید ہے سب لوگ بخیر ہوں گے۔

خیر اندیش
عبدالعلیم

اس بات چیت کا ابتدائی حصہ جس نے ماہنامہ ''کتاب'' کے صرف تین سوا تین صفحات گھیرے۔ تھے علیم صاحب کو طویل نظر آ رہا تھا کیونکہ وہ ان کے بارے میں تھا۔ اس انٹرویو میں علیم صاحب نے اپنے تنقیدی نظریات کی وضاحت بھی کی ہے اور اپنے بارے میں چند باتوں کا انکشاف بھی کیا ہے۔ وہ Hindustan Association of Central Europe کے صدر اس وقت تھے، جب ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اس کے سکریٹری تھے۔ ان سے قبل اس ایسوسی ایشن کے صدر ڈاکٹر ذکر حسین تھے۔ علیم صاحب کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے بانی رکن ہونے کے علاوہ اس کی پہلی مجلس عاملہ کے ممبر بھی تھے۔ انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنّفین کی تشکیل اور اس کے منشور کی تیاری میں اہم رول ادا کیا تھا۔ وہ جامعہ اکاڈمی کے پہلے دو فیلوز میں تھے۔ نہرو رپورٹ کا بڑا حصہ علیم صاحب نے اُردو میں ترجمہ کیا تھا، ''قومی آواز'' کے پیش رو ''ہفت روزہ ہندستان'' کے وہ مینیجنگ ڈائرکٹر تھے۔ دوسرے دو ڈائرکٹر تھے اچاریہ نریندر دیو اور رفیع احمد قدوائی۔

---

[۱] میری والدہ اور خالہ جان کے لکھنؤ سے چلے جانے کے بعد علیم صاحب لکھنؤ آتے تو قیام ڈاکٹر شمشیر بہادر صمدی صاحب کے یہاں ہی کرتے۔ ۱۹۶۷ء میں اتر پردیش کے گورنر غالباً ڈاکٹر گوپالا ریڈی تھے جن سے علیم صاحب کے دیرینہ تعلقات تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ جب بھی لکھنؤ آئیں قیام گورنر ہاؤس میں کریں، لیکن علیم صاحب صمدی صاحب کے یہاں ہی قیام کرتے رہے۔

علیم صاحب نے خاموشی کو خوش بیانی کا اعجاز بخشا تھا۔ بڑے سے بڑا غم، بڑی سے بڑی خوشی، ان کے پاس سے مؤدّب گزر جاتے تھے۔ لیکن دل بہر حال دل ہے، ان کا اثر قبول کرتا تھا۔ احتشام صاحب کے انتقال سے قبل ان پر دل کے دو شدید دورے پڑ چکے تھے۔ میں نے ان سے مرحوم پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی تو ایک منٹ چپ رہے، پھر بولے۔ ’’دل پر بہت بوجھ پڑے گا‘‘ اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

عمر کے آخری دو برسوں میں ان کو شدید صدموں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسکوٹر کے حادثے میں ان کی بڑی بیٹی کے شوہر کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ علیم صاحب خاموش رہے۔ ۲۷ر دسمبر کو لکھنؤ میں بھانجے کی شادی تھی۔ ایک روز قبل بیگم علیم کا خط آیا۔

’’حسین ظہیر صاحب کے انتقال کے بعد سے آپ کے بھائی صاحب بالکل خاموش ہیں، تین راتوں سے سو نہیں سکے ہیں‘‘

انتقال سے ایک ہفتہ قبل زمانۂ طالب علمی میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے ہوسٹل میں ان کے روم پارٹنر اور بے حد عزیز دوست ڈاکٹر خان کا انتقال ہو گیا۔ علیم صاحب نے چار راتیں جاگ کر کاٹیں۔ پانچویں دن اسپتال میں داخل ہوئے، چھٹے دن ’’ہیں‘‘ سے ’’تھے‘‘ ہو گئے۔

مسز خان کو تعزیت کا خط لکھا جس کی آخری سطریں تھیں:

’’آج وہ کل ہماری باری ہے‘‘

خدا حافظ

عبدالعلیم

علیم صاحب بات بہت کم کرتے تھے، اپنے بارے میں اور بھی کم۔ اپنے پروگراموں کے بارے میں اس سے بھی کم۔

اُن کے علی گڑھ یونیورسٹی جانے کے بارے میں شہر کے علمی، ادبی حلقوں میں اور کافی

ہاؤس میں خبریں گرم ہیں......... لیکن علیم صاحب خاموش ہیں۔ پھر ایک دن اہلیہ سے بولے

''علی گڑھ چلیے گا''

''آپ کچھ بتاتے ہی نہیں''

''تو چلیے نا!''

''کب؟''

''اگلے ہفتہ''

.... پرسوں چین جانا ہے، کل شام لندن کے لیے روانگی ہے..... دس دن کے لیے، اگلے ہفتہ مصر جانا ہے''۔

''کل دہلی جا رہا ہوں''

''کیوں؟''

''ترقی اُردو بیورو[1] کا چارج لینا ہے؟

نہ میں کی تکرار، نہ ہم کا ورد، نہ بے جا انکسار، نہ حق بجانب افتخار۔

۱۱ فروری کو ایک ہفتہ کا دورہ کر کے پنجاب سے لوٹے۔ ۱۲ سے ۱۶ فروری تک ایک لمحہ کے لیے سو نہ سکے، لیکن روزانہ ترقی اُردو بیورو کے دفتر جاتے رہے...... وزارتِ تعلیم میں عربی مخطوطات کمیٹی کے جلسہ میں شرکت کی، جامعہ میں خاصی طویل تقریر کی۔ ۱۶ فروری کی شب میں ڈاکٹر دیکھنے آیا تو اسے ہدایت کر دی کہ بیماری کا حال گھر والوں کو نہ معلوم ہو سکے۔ ۱۷ فروری کو اسپتال گئے تو گھر والوں سے کہا کہ Check-up کے لیے جا رہا ہوں۔ ممکن ہے ایک دن رکنا پڑے۔

۱۸ فروری کی صبح۔

---

[1] علیم صاحب ترقی اُردو بیورو کے پہلے ایسے چیئرمین تھے جو مرکزی وزیر نہیں تھے۔ اُن سے قبل چیرمین مرکزی وزیر تعلیم ہی ہوتے تھے۔ وہ حکومت ہند کے پہلے اور تاحال آخری مشیر اُردو بھی تھے۔ حکومت ہند کی اُردو پالیسی میں خوشگوار تبدیلیاں اسی دوران ہوئیں۔

''ڈاکٹر صاحب طبیعت کیسی ہے''

''اچھا ہوں''

''کوئی تکلیف؟''

'' کوئی خاص تکلیف نہیں۔ پیر میں معمولی سا درد ہے۔ شاید خون چڑھانے کی وجہ سے .... لیکن اب کم ہے''

یہ کہہ کر آنکھیں بند کرلیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

انتقال کے بعد اُن کی میز پر عربی زبان وادب سے متعلق کئی مضامین کے خاکوں کے علاوہ ایک لفافہ ملا جس پر مکتوب الیہ کا نام و پتہ درج تھا۔ خط کے ساتھ ایک خاصی بڑی رقم کا ڈرافٹ پن کیا ہوا تھا۔ لیکن وہ خط نہیں ملا جس کا یہ جواب تھا۔

علیم صاحب نے لکھا تھا:

مجھے نہ تمھارا نام یاد ہے نہ شکل وصورت، نہ یہ یاد ہے کہ میں نے تمھاری یا کسی طالب علم کی کبھی کوئی مدد کی۔ بفرض محال تمھاری مدد کی بھی گئی تو اُس کی جزا کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ رقم واپس کردی جائے بلکہ مناسب یہ ہوگا کہ تم دوسروں کے ساتھ وہ سلوک کرو جو تمھارے ساتھ دوسروں نے کیا۔ تمھارا ڈرافٹ منسلک ہے۔[1]

وہ ۳۰/مارچ کو حکومت ہند کا وفد لے کر پاکستان جانے والے تھے، اُس کے بعد اُنھیں لندن کی اسلامی کانفرنس میں شرکت کرنا تھی، ایک ریاست کی گورنری اُن کی منظوری کا انتظار کررہی تھی .... ایک طرف یہ سب کچھ تھا اور دوسری طرف وہ چپکے چپکے آخری سفر کی تیاریاں کررہے تھے۔ اِن تیاریوں کی اُنھوں نے کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دی۔

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

---

[1] یہ عبارت یادداشت سے لکھی گئی ہے لیکن نفس مضمون یہی تھا۔

حیات اللہ انصاری

انجمن ترقی پسند مصنّفین کے اس جلسہ میں تو میں موجود نہیں تھا جس میں حیات اللہ انصاری صاحب نے اپنا وہ مضمون پڑھا تھا جس کی صورت انجمن کی تنقید سے زیادہ فردِ جرم کی سی تھی، لیکن اگلے جلسے میں ضرور شریک تھا، جس میں سکریٹری نے پچھلے جلسہ کی رپورٹ پیش کی تھی۔

حیات اللہ صاحب نے ترقی پسند ادیبوں کو سوچنے، سمجھنے اور حقیقتوں سے آنکھیں ملانے کی تلقین کی تھی، اور انجمن پر طرح طرح کے الزامات لگائے تھے۔ ظاہر ہے اس مضمون کا ردِ عمل بے حد سخت ہوا تھا اور ڈاکٹر علیم نے جن کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے ''ہفت روزہ ہندستان'' میں وہ بطور مدیر کام کر چکے تھے کہا تھا!

''حیات اللہ انصاری صاحب یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ صرف وہی دیکھتے، سمجھتے اور سوچتے ہیں۔ ہم کو بھی علم و ادب سے دلچسپی ہے، ہم لوگ بھی پڑھتے لکھتے رہتے ہیں اور حقیقتوں کو نہ صرف دیکھنے بلکہ ان کا مقابلہ کرنے کا یارا بھی رکھتے ہیں''۔

(یہ الفاظ میں نے اپنی یادداشت سے لکھے ہیں)

یہ واقعہ غالباً ۱۹۵۰ء کا ہے۔ اُن دنوں سرور صاحب کے بیرو روڈ کے مکان پر انجمن کی نشستوں میں ڈاکٹر علیم، احتشام حسین، شوکت صدیقی، مسیح الحسن رضوی، رضا انصاری، ڈاکٹر رشید جہاں، کمال احمد صدیقی، سلام مچھلی شہری، ایاز انصاری، اچل سنگھ، مجاز، منظر سلیم، حبیب صاحب، برج موہن ناتھ کاچر، محمد شکیل، مجید پرویز اور درجنوں دوسرے ادیب و شاعر، یونیورسٹی کے پروفیسر اور ادب اور ثقافت سے دلچسپی رکھنے والے حضرات باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔ اُن میں سے جو سرکاری ملازمتوں میں تھے وہ رجسٹر پر دستخط نہیں کرتے تھے کیونکہ انجمن کو سیاسی تنظیم قرار دے دیا گیا تھا۔

اس وقت تک میں نے حیات اللہ صاحب کو نہیں دیکھا تھا اور اس پس منظر سے واقف نہیں تھا جس نے گاندھیائی نقطۂ نظر سے ان کے شغف کو ترقی پسندی کی مخالفت تک پہنچا دیا تھا اور وہ اُردو حلقوں میں ''انجمن'' دشمنی کی علامت بن گئے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین کے نقطۂ نظر کی مخالفت اس وقت بعض ایسے لوگوں نے بھی کی تھی جو ابتدا سے اس کے ساتھ تھے لیکن حیات اللہ انصاری کی طرح ان لوگوں نے متشدد اور جارحانہ رخ اختیار نہیں کیا تھا۔

یادش بخیر وہ زمانہ خوابوں کا تھا۔ انقلاب کا خواب، زندگی کو بہتر بنانے کا خواب، عوام کی خوشحالی اور پُر مسرّت زندگی کا خواب، اور ان خوابوں کی راہ میں ''روڑے اٹکانے والے'' دشمن اور Villain بن گئے تھے۔ ایسے ہی ایک Villain حیات اللہ انصاری بھی تھے۔

کئی مہینے بعد ''پیپلس پبلشنگ ہاؤس'' کے سامنے سے حیات اللہ صاحب گذرے تو مسعود نے، جو ان دنوں اس ادارے کے منیجر تھے، مجھ سے کہا۔

''کیا یہ حضرت جھکنا نہیں جانتے؟

''اپنے آقاؤں کے سامنے تو ضرور جھکتے ہوں گے''۔

میرے لہجہ میں تلخی بھی تھی اور نفرت بھی، لیکن انجمن کے جلسوں کی تفصیلی روداد یں ''قومی آواز'' میں باقاعدگی سے شائع ہوتیں، اور ایک دن جب یہ احساس ہوا کہ ''قومی آواز''

میں ایسے بہت سے چہرے نظر آتے ہیں جو انجمن کے جلسوں میں نہ صرف شریک ہوتے ہیں بلکہ سرگرم ترقی پسند ہیں تو یک گونہ حیرت ہوئی۔ مسیح الحسن رضوی، حبیب صاحب، منظر سلیم، رضا انصاری، چند ایسے ہی چہرے تھے۔

کئی برس بعد بلکہ تقریباً چالیس سال بعد میں نے ایک دن حیات اللہ صاحب سے کہا ''آپ کی کمیونسٹ دشمنی دکھاوے (اصل لفظ Superficial تھا) کی ہے''۔

حیات اللہ صاحب میری اس جسارت پر جس قدر حیران تھے اس سے زیادہ میرے اس خیال پر۔

''کیا مطلب؟'' ان کے لہجہ میں ہلکی سی تلخی تھی۔

''آپ کمیونسٹ دشمن کی حیثیت سے مشہور یا بدنام ہیں۔ لیکن کیا یہ محض اتفاق ہے کہ آپ کو ''قومی آواز'' کے لیے کمیونسٹوں اور ان کے ہمنواؤں کے علاوہ کوئی ملتا ہی نہ تھا''۔

حیات اللہ صاحب میری طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

''عشرت صاحب سامراج دشمن، رضا انصاری صاحب ترقی پسند، محمد حسن قدوائی صاحب کمیونسٹ، مسیح صاحب کمیونسٹ، منظر سلیم، مکین احسن کلیم، حبیب صاحب کمیونسٹ اور میں۔۔۔ مجیب صاحب کمیونسٹ دوست اور قیصر تمکین اگرچہ ترقی پسندوں سے ناراض رہتے ہیں لیکن رجعت پسند بہر حال نہیں''۔

''میں نے اس نقطۂ نظر سے کبھی نہیں سوچا تھا'' حیات اللہ صاحب مسکرائے اور اپنے کمرے میں دیوار پر ٹنگی ہوئی پنڈت نہرو کی تصویر کی طرف دیکھنے لگے۔ گاندھی جی کی ایک چھوٹی سی تصویر دوسری دیوار پر آویزاں تھی۔

حیات اللہ صاحب کی شہرت کا ایک اہم پہلو اُن کی یہی کمیونسٹ دشمنی تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک زمانہ میں وہ کمیونسٹ نہیں تو تقریباً کمیونسٹ ضرور تھے۔ کمیونسٹوں سے

اُن کی دوری کی ابتدا ایک تکلیف دہ سلسلۂ واقعات سے ہوئی، جس میں فرنگی محل کے نواح کے ایک مکان کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اس کہانی کے کردار تھے سردار جعفری، فرحت اللہ انصاری، مجاز، اور سبطِ حسن ایک جانب، اگرچہ سب ایک دوسرے کے رقیب، اور حیات اللہ صاحب دوسری جانب اور درمیان میں تھیں ایک خاتون جو ''چارمنگ لیڈی[1]'' کے نام سے مشہور تھیں۔

جلسے جلوسوں کی حد تک تو حیات اللہ صاحب انجمن ترقی پسند مصنّفین سے الگ ہو گئے لیکن دل و دماغ میں گاندھی واد اور کمیونزم کے درمیان کشمکش برسوں جاری رہی۔ حد یہ ہے کہ ''قومی آواز'' کے مدیر کے انتخاب کا وقت آیا تو رفیع احمد قدوائی صاحب نے ان کا نام مسترد کر دیا کیوں کہ ان کے خیال میں وہ متشدد کمیونسٹ تھے۔ حیات اللہ صاحب نے علیم صاحب سے جو ''ہفت روزہ ہندستان'' کے مینجنگ ڈائرکٹر رہ چکے تھے، مداخلت کرنے کی درخواست کی اور علیم صاحب نے قدوائی صاحب کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر آمادہ کر لیا۔

حیات اللہ انصاری صاحب اپنی غیر مطبوعہ خود نوشت میں لکھتے ہیں۔

''علی گڑھ میں میرا رجحان کمیونزم کی طرف زیادہ ہو گیا تھا اور کبھی کبھی ایسا بھی لگتا تھا جیسے کہ میں نے اس کے حق میں فیصلہ کر لیا ہے، لیکن پھر نمک ستیہ گرہ کے وہ اثرات یاد آئے جو میں نے لوگوں کے دلوں پر محسوس کیے تھے، دل کہتا کہ یہ اثرات باطل نہیں ہو سکتے۔

''اس کشمکش سے مجھے دو تجربوں نے نکالا۔ ایک تو گاندھی جی کی ستیہ گرہ نے، دوسرے میرے مزدوروں کی طاقت کے مطالعہ نے۔ آخر میں فیصلہ میں نے کیا ہے ۱۹۴۸ء میں یعنی لگ بھگ پندرہ سال کی کشمکش کے بعد''۔

---

[1] نام بدل دیا گیا ہے۔ یہ ساری باتیں مجھے فرحت اللہ انصاری صاحب سے معلوم ہوئی تھیں۔ فرحت صاحب نے ہی علی گڑھ میں سردار جعفری کو لفظ ''بورژواشی'' سے متعارف کرایا تھا۔

اس تحریر سے اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ ''قومی آواز'' کے اجرا کے وقت حیات اللہ صاحب پر کمیونزم کے اثرات موجود تھے اور یہ اثرات اس قدر شدید تھے کہ ان سے چھٹکارا پانے میں انھیں لگ بھگ پندرہ سال لگ گئے اور وہ بھی کشمکش کے پندرہ سال۔

قدوائی صاحب نے جو کمیونسٹ پارٹی کے سخت خلاف تھے حیات اللہ صاحب کے دل و دماغ میں کمیونزم کی راکھ کو، جس کی گرمی بھی مائل بہ زوال تھی، متشدد قسم کا کمیونزم سمجھ کر ایڈیٹر کے طور پر علی ظہیر مرحوم کے ایک عزیز کو پروانۂ تقرری بھی جاری کر دیا تھا۔

حیات اللہ صاحب علیم صاحب سے بہت متاثر تھے اور اُنہوں نے مداخلت نہ کی ہوتی تو ''قومی آواز'' صحافت میں وہ مقام کبھی نہ حاصل کر پاتا جس نے اُسے اُردو کا پہلا جدید روزنامہ بنا دیا۔

میں یونیورسٹی میں پہنچا تو ایک دن میں نے عشرت صاحب سے، جو اُن دنوں بھی ''دُنیا کا حال'' نام کے اپنے کالم کے لیے ساری صحافی برادری میں مشہور تھے، کہا کہ اگر میں یونیورسٹی کی خبریں دیا کروں تو کیا آپ چھاپیں گے۔ عشرت صاحب حیات اللہ کے پاس گئے، ساری بات بتائی اور مجھے اسی وقت یونیورسٹی کا نامہ نگار بنا دیا گیا۔ اعزازی نامہ نگار کی حیثیت سے تقرری کا خط میرے حوالے کرتے ہوئے حیات اللہ صاحب نے کہا ''آپ نامہ نگار اچھے بنیں گے، اس میں جاسوسی کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔''

''لیکن میرے جاسوسی ناول تو فرضی ناموں سے چھپتے ہیں'' میں نے حیرت سے کہا۔

''میں بھی چھوٹا موٹا جاسوس ہوں'' وہ مسکرائے۔ (یہ بات بہت دنوں بعد معلوم ہوئی کہ جاسوسی ناولوں سے حیات اللہ صاحب کو خاصی دلچسپی تھی)

یونیورسٹی کے طلبہ کی تحریک جس کی قیادت اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے کرشنا نند، رابن مترا، ابن حسن، انرد گپتا، خدیجہ انصاری اور سوشلسٹ پارٹی کے ترپاٹھی کر رہے تھے

زور و شور سے جاری تھی۔ شہر کے بیشتر حصّوں میں کرفیو لگا ہوا تھا۔ حیات اللہ صاحب کو میرے سیاسی خیالات، اسٹوڈینٹس فیڈریشن سے میرے تعلق اور طلبہ کی تحریک کے سلسلے میں میری سرگرمیوں کا علم تھا لیکن میری اسٹوری (اخباری اصطلاح میں خبر کو اسٹوری کہتے ہیں۔) روزانہ ''قومی آواز'' میں آن بان سے شائع ہوتی۔ پھر چند دن بعد میں گرفتار کرلیا گیا۔ میں نے قیصر باغ کوتوالی میں پریس پاس دکھایا تو ایک مجسٹریٹ نے جو گرفتاریوں کو قانونی شکل دینے کے لیے وہاں موجود تھے مجھے حوالات سے باہر کردیا۔ اتّفاق سے اسی وقت تھانہ کے انچارج برگوتری، جو اُن دنوں ظاہر ہے بے حد مصروف تھے، آن پہنچے اور مجھے دیکھتے ہی بولے ''تم باہر کیسے آئے؟'' اور مجھے دوبارہ حوالات میں بند کردیا گیا اور مجسٹریٹ صاحب پولیس افسر کا مونہہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ اُسی شام متعدد دوسرے طلبہ کے ساتھ مجھے بھی جیل بھیج دیا گیا۔

تین دن بعد یوپی اسمبلی میں تحریکِ التوا کے پیش ہوتے ہی مجھے رہا کر کے جیل کی گاڑی میں امین آباد لاکر چھوڑ دیا گیا تو میں سیدھا ''قومی آواز'' پہنچا، لیکن یہ یقین تھا کہ اب نامہ نگاری تو گئی۔

حیات اللہ صاحب نے مجھے دیکھا تو کہا۔ ''آج تو آپ اسمبلی کی اسٹوری میں آگئے''۔

اگلے دن ''قومی آواز'' میں تحریکِ التوا، میری رہائی کی خبر اور طلبہ کی تحریک کے سلسلے میں میری دی ہوئی خبریں ایک ساتھ شائع ہوئیں۔

دو سال بعد یعنی ۱۹۵۷ء میں جب حبیب صاحب بطور مترجم تاشقند چلے گئے، میں ''قومی آواز'' سے باقاعدہ طور پر وابستہ ہوگیا۔ لیکن اس باقاعدہ وابستگی سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ بھی ہے جس سے حیات اللہ صاحب کی شخصیت کے ایک اور پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔

چھ مہینے تک بطور نو آموز (Apprentice) کام کرنے کے بعد جب میری تقرری یقینی ہوگئی تھی ایک اور صاحب، جنہیں قومی آواز، نیشنل ہیرالڈ اور نوجیون کے ناشر ادارہ ایسوشی

ایٹیڈ جرنلس کے ایک ڈائرکٹر کی سرگرم حمایت حاصل تھی، بطور امیدوار میدان میں اتر آئے اور دفتر میں ایک طرح کا سرد ماحول پیدا ہو گیا۔ اب ایک جگہ کے لیے جس کی ماہانہ تنخواہ صرف ۸۰ روپے تھی، دو امیدوار تھے۔ چند دن بعد حیات اللہ صاحب نے مجھے بلایا اور کہا۔

''اب دو امیدوار ہیں۔ آپ دونوں کا مقابلہ ہو جائے'' وہ مسکرائے۔

''میں کسی مقابلہ میں نہیں بیٹھوں گا'' میں نے کہا۔

''کیوں، کیا آپ ان سے ڈرتے ہیں؟

''جی نہیں'' میں نے کہا''۔ میرے دوست ہیں، برسوں پرانی دوستی ہے اور دوسرے یہ کہ میری ایک چھوٹی موٹی ادبی حیثیت ہے (اللہ اللہ کیا کیا خوش فہمیاں تھیں اُن دنوں)۔ آپ کسی مصلحت یا دباؤ کے تحت میرے حریف اُمیدوار کو لینے پر مجبور ہو جا گئے تو بھی ظاہر یہی کریں گے کہ وہ بہتر اہلیت کا مالک تھا۔ میں اس کا موقعہ آپ کو دینا نہیں دینا چاہتا''۔

جملہ بے حد سخت تھا اور عمر کی اس منزل میں ہی ممکن تھا جب عشق آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑتا ہے۔

مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ حیات اللہ صاحب میرا یہ جملہ سننے کے بعد اپنی کرسی پر ٹیک لگا کر تقریباً نیم دراز ہو گئے تھے۔ ان کا ایک ہاتھ کرسی کے اس چوڑے ہتھے پر تھا جس پر کاغذ رکھ کر وہ اداریہ لکھا کرتے تھے اور دوسرا پیشانی پر۔ مجھ سے نظریں ملائے بغیر بولے۔

''آپ کام کرتے رہیے۔ میں بعد میں بتاؤں گا!''

میں کمرے سے باہر چلا آیا اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر ترجمہ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ان کی میز کی مشہور گھنٹی، جس کی آواز نیچے برآمدے تک سنائی دیتی تھی، بجی تو مدار بخش مرحوم جو اس وقت کچھ ایسے بوڑھے نہ تھے اپنا سر کمر سے خاصا آگے بڑھائے ہوئے حیات اللہ صاحب کے کمرے میں گئے اور تقریباً فوراً ہی واپس آئے اور میرے پاس آ کر سر کو ذرا سی جنبش دیتے ہوئے بولے ''بلاوت ہیں''

میں دھڑ دھڑ کرتے ہوئے دل کے ساتھ حیات اللہ صاحب کے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

''آپ کی تقرری کر دی ہے''۔

غالباً ۱۹۵۹ء یا ۱۹۶۰ء میں کمیونسٹ پارٹی کی ریاستی کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی اور سارا شہر لالہ زار بن گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کمیونسٹ پارٹی کانگریس کی اصل حریف کے طور پر تیزی سے اُبھر رہی تھی۔ اتر پردیش کے مشرقی اضلاع اس کا گڑھ تھے، ریاستی اسمبلی کی چودہ پندرہ نشستوں پر اس کا قبضہ تھا اور اس سے زیادہ نشستیں اس نے بہت تھوڑے سے ووٹوں سے گنوادی تھیں۔ ہندی کے مشہور ادیب یشپال مرحوم جن کا اُردو کی جانب رویہ شکوک وشبہات سے کبھی بالاتر نہیں رہا مجلس استقبالیہ کے چیئرمین تھے۔ حیات اللہ صاحب نے کمیونسٹ پارٹی کو اُردو دشمن اور مسلمان دشمن ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک نہایت سخت اداریہ لکھا، بلکہ شائد تین اداریے لکھے۔ میں نے دفتر میں ہی بیٹھ کر اس کا اسی قدر سخت جواب لکھا اور شہر کی شاخ کے سکریٹری بابو خاں کو لے کر حیات اللہ صاحب کے کمرے میں گیا اور مراسلہ ان کو دیتے ہوئے کہا۔ ''بابو خاں صاحب نے یہ مراسلہ آپ کے اداریہ کے سلسلے میں لکھا ہے''

حیات اللہ صاحب نے، جنہیں شائد اس بات علم ہو چکا تھا کہ جواب میں نے لکھا ہے، کہا

''یہ تو آپ کی تحریر ہے''۔

''لیکن دستخط تو بابو خاں صاحب کے ہیں''

وہ مسکرائے اور مراسلہ کے صفحات اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔

''بھائی یہ بے حد طویل ہے''

''آپ کے اداریے کیا کم ....'' میں نے کہا

''اچھا، اچھا دیکھوں گا۔'' اُنھوں نے کہا اور گفتگو ختم کر دی۔

اگلے دن یہ مراسلہ ''قومی آواز'' میں من وعن شائع ہوا۔

اُتر پردیش میں اُردو کی دستخطی مہم کی تکمیل کے بعد جب ۲۲ لاکھ دستخطوں کے ساتھ یادداشت صدر جمہوریہ کو پیش کی جانے والی تھی، ایک دن ''قومی آواز'' میں صفحہ اوّل پر ایک دو کالمہ خبر شائع ہوئی، سرخی تھی ''اُردو کا ہراول دستہ دہلی میں''۔ پوری خبر تو یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ حیات اللہ صاحب اور سلطانہ حیات صاحبہ غالباً محضر نامہ پیش کرنے کے سلسلے میں کسی کام سے دہلی گئے تھے اور انہوں نے اس دو۔رُکنی ٹیم کو ہراول دستہ کا نام دے دیا تھا۔ یہ خبر خود حیات اللہ صاحب نے لکھی تھی، دہلی کے لیے روانگی سے چند گھنٹے قبل۔ چند دنوں بعد علی گڑھ سے قاضی عبدالغفار اور ڈاکٹر علیم نے خاصے سخت الفاظ میں اس خبر کی تردید کی اور ان دونوں کو ہراول دستہ ماننے سے انکار کردیا۔ یہ تردید بھی ''قومی آواز'' کے پہلے صفحہ پر دو کالمہ سرخی کے ساتھ شائع ہوئی۔

کمیونزم کی طرف حیات اللہ صاحب کے جھکاؤ کا ذکر آچکا ہے۔ ایک زمانے میں وہ خاصے پکّے کمیونسٹ تھے اور اپنے ان ہی خیالات کی وجہ سے انھیں فرنگی محل کی سکونت ترک کرنا پڑی تھی۔ ''ڈھائی سیر آٹا'' نام کا افسانہ جو ماہنامہ ''جامعہ'' میں شائع ہوا تھا اسی زمانہ کی یادگار ہے اور اسے پریم چند کے ''سوا سیر گیہوں'' پر زمانی تقدّم حاصل ہے۔

ایک بات اور: چین کے حملے تک کمیونسٹ پارٹی کانگریس کی جگہ لینے کے لیے تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ کیرالا، بنگال، بہار، پنجاب اور مدارس میں حزب مخالف کمیونسٹ پارٹی ہی تھی۔ محض دس بارہ دن کی تیاری کے بعد کسی بھی ریاستی دارالسلطنت میں لاکھ دو لاکھ مظاہرین اکٹھا کرسکتی تھی۔ کیرالا میں کمیونسٹ حکومت قائم ہونے کے بعد، جو دُنیا میں جمہوری طریقوں سے اقتدار حاصل کرنے والی پہلی ایسی حکومت تھی، شری نمبور دری پد نے ایک پریس کانفرنس

میں کہا تھا ''اس بار تو ہم نے ایک دوکان کھولی ہے (کیرالا) اگلے انتخابات کے بعد ہم دوسری دوکانیں کھولیں گے'' اور بمبئی میں ایک عظیم الشان جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے شری پدامرت ڈانگے نے کہا تھا۔ ''سرخ سویرا اب زیادہ دور نہیں۔ معلوم نہیں کس صبح ہم سو کر اٹھیں تو معلوم ہو کہ ملک میں انقلاب آ چکا ہے''۔ چند سال بعد کیرالا حکومت کی برطرفی کے خلاف کمیونسٹ پارٹی نے دہلی میں جو مظاہرہ کیا تھا اس نے تو پنڈت گووند بلبھ پنت تک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

اور حیات اللہ انصاری صاحب کانگریس کے واحد اُردو اخبار کے ایڈیٹر تھے۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں ان کے ذاتی اختلافات، گاندھی جی سے شغف اور کانگریسی اخبار کی ایڈیٹری نے کمیونسٹ دشمنی کو ان کے لیے پوستین بنا دیا تھا۔

لیکن حیات اللہ صاحب اُردو کے صفِ اوّل کے افسانہ نگار اور ناول نگار بھی تھے اور ان کی تخلیقات کو ان کے نظریات کا پیمانہ بنایا جائے تو ''لہو کے پھول'' سے قطع نظر (جو اِسی زمانہ میں لکھا گیا جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے) جس میں جگہ جگہ ان کے فن کو صحافتی رنگ سے زیادہ ان کے سیاسی افکار اور واقعات کی بالادستی نے مجروح کیا ہے، ان کے افسانوں اور دوسرے ناولوں پر کمیونسٹ دشمنی کا نہ صرف یہ کہ سایہ تک نہیں بلکہ ان میں سے بیشتر ترقی پسند فکر کے بہترین نمونے ہیں۔

حیات اللہ انصاری صاحب نے اُردو اخبار نویسی کو صحافت کے جدید رُجحانات سے روشناس کرایا، خبروں کو ادارتی پالیسی کی تابع بنانے سے احتراز کیا، خبر کی سرخی کو معروضی اندازِ نظر دیا، نت نئے تجربے کیے جن میں سے کچھ ناکام ثابت ہوئے اور کچھ کامیاب (خبر کو سرخی سے شروع کرنا ایک ناکام تجربہ تھا اور سرخی میں سے رائے کے عنصر کو خارج کرنا ایک کامیاب تجربہ) اور ''قومی آواز'' کو ایک زندہ اور متحرّک اخبار بنا دیا جسے اُن کے مخالفین بھی نظر انداز نہیں کر پاتے تھے۔

روزنامہ ''امروز'' نے اپنے ابتدائی شماروں کے بارے میں اربابِ قلم کی رائیں شائع

کی تھیں۔ منٹو نے لکھا تھا ''امروز'' دیکھ کر ایسا لگا جیسے ''قومی آواز'' پڑھ رہا ہوں۔ (الفاظ مختلف ہو سکتے ہیں)

حیات اللہ صاحب ''قومی آواز'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کے سبکدوش ہوئے تو مولانا عبدالماجد دریابادی نے جن سے اُن کی نوک جھونک چلا کرتی تھی، ''صدقِ جدید'' میں اُن کی صحافتی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اپنے شذرہ کو اس مصرع پر ختم کیا تھا۔

لذّتِ غم نہ رہی یار کے اُٹھ جانے سے

حیات اللہ صاحب اپنی خودنوشت کا بڑا حصّہ لکھ چکے ہیں۔ وہ اسے مکمّل کر سکے اور انہوں نے اظہارِ حال میں اسی جرأت اور ہمّت کا مظاہرہ کیا جو وہ ''قومی آواز'' کے کالموں میں کیا کرتے تھے تو ان کی شخصیت کے بعض ایسے گوشے سامنے آئیں گے جو اَب تک نظروں سے اُوجھل ہیں۔

•

ایک ماہر پیراک، گھڑوں، مٹکوں اور آستینوں میں سانپ پالنے کے شوقین، ماؤنٹ ایوریسٹ سر کرنے کے لیے برسوں سرگرداں رہنے والے، بین الاقوامی فلم میلہ کے پہلے انعام کی مستحق قرار دی جانے والی فلم کے کہانی کار (کینس فلم میلہ، فلم نیچا نگر، کہانی حیات اللہ انصاری، پروڈیوسر چیتن آنند)، صفِ اوّل کے صحافی، ناول نگار اور افسانہ نویس اور اپنے خوابوں کو سرد منطق سے بکھیر دینے والے حیات اللہ انصای ایک مجموعۂ اضداد شخصیت کے مالک ہیں۔ یہ خوبی ہر بڑے انسان میں ہوتی ہے۔

ان تضادات کو صرف اُن کی خودنوشت ہی حل کر سکتی ہے۔ ہمارے لیے اس کی اشاعت کا انتظار کرنے کے علاوہ چارہ بھی کیا ہے۔

پس نوشت

آخر یہ شمع ۱۸ر فروری ۱۹۹۹ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ رہے نام اللہ کا۔

موت نے جوں ہی ان کے درِ دل پر آہستہ سے دستک دی، وہ آخری سفر پر کچھ اس

طرح چل پڑے جیسے مدتوں سے اس کے انتظار میں تھے۔

مرحوم نے اپنی خودنوشت تقریباً مکمل کرلی تھی۔ اس کے کچھ حصے ان کی عنایت سے اس وقت دیکھ سکا تھا جب میں نے روزنامہ ''صحافت'' کا حیات اللہ انصاری نمبر ترتیب دیا تھا۔ اس میں ایک ایسے دور کی روداد بھی رقم ہے جب سیاست خدمت اور عبادت تھی۔ اس میں بہت کچھ ایسا ہے جو مسودہ ہی میں دفن رہ گیا تو یہ ایک بڑا المیہ ہوگا اور ادبی، سیاسی اور سماجی زندگی کے بہت سے واقعات، افکار اور نظریات کی آمیزش اور آویزش اور کانگرس میں رجعت پسندی، ترقی پسندی اور درمیانی راہ کے حامیوں کی ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی کوششوں کی کہانی شاید معدوم ہو جائے گی۔

مزید: کل یعنی ۲۳؍دسمبر ۲۰۰۱ء کو پرانے خطوط اور کاغذات جو ۱۳ سال قبل نقلِ مکانی کے وقت ایک چادر میں باندھ دیے گئے تھے اور اسی طرح رکھے ہوئے تھے دیکھ رہا تھا۔ اس میں میرے نام حیات اللہ صاحب کے تین چار چند سطری خطوط کے علاوہ ایک مختصر سی خبر جو اُنہیں کی تحریر میں ہے، ملی۔ اس خبر کی شانِ نزول دلچسپ ہے۔ حیات اللہ صاحب اپنی بیگم سلطانہ حیات کے ساتھ دہلی سے آئے تھے۔ جاڑوں کا موسم تھا۔ صبح، پانچ ساڑھے پانچ یا چھے بجے کا وقت اور سڑکیں سنسان۔ موجودہ او۔سی۔آر بلڈنگ کے پاس چند غنڈوں نے جو چاقوؤں سے لیس تھے اُن کا سامان چھیننے کی کوشش کی۔ حیات اللہ صاحب رکشے سے کود پڑے اور اُنہوں نے چاروں غنڈوں کو مار بھگایا۔ اُن دنوں وہ نظر باغ میں رہتے تھے۔ یہ خبر اُسی واقعہ سے متعلق ہے۔ زندگی نے مہلت دی تو یہ مختصر خطوط اپنی خودنوشت ''جو یاد رہا'' میں جس کے تقریباً تین سو صفحات لکھے جا چکے ہیں، پیش کروں گا۔

■ ■

ایم۔ چلپتِ راؤ
(ایم۔سی)

اشوکا ہوٹل کا بینکوئٹ ہال غیر ملکی سفارت کاروں، مرکزی حکومت کے متعدد وزرا، کئی ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ، حکومتِ ہند کے اعلیٰ ترین افسران، کمیونسٹ پارٹی اور دوسری جمہوری اور بائیں بازو کی پارٹیوں کے لیڈروں اور ممتاز ترین ادیبوں اور فنکاروں کی موجودگی سے چھلک رہا تھا۔ موقع تھا پولینڈ کا قومی دن منانے کے لیے اس ملک کے سفارت خانہ کی جانب سے ایک نہایت شاندار عصرانہ۔ ان اہم اور ممتاز لوگوں کے درمیان اتفاق سے لکھنؤ یونیورسٹی کے چار طلبہ بھی تھے جو ان دنوں آل انڈیا ریڈیو کے زیر اہتمام ملک کی یونیورسٹیوں کے ایک کل ہند مقابلے کے سلسلے میں دہلی میں موجود تھے۔ ان چاروں طلبہ کا قیام مشہور صحافی اور مصوّری کے پارکھ نجم الحسن کے یہاں تھا جو دریا گنج میں آج کے گولچا سینما کے تقریباً سامنے سڑک کی دوسری جانب کی ایک عمارت کی پہلی منزل میں رہتے تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کی ٹیم نے مختلف یونیورسٹیوں کی پانچ ٹیموں کو شکست دے کر اپنی یونیورسٹی کے لیے آل انڈیا ریڈیو کی ٹرافی پہلی بار جیتی تھی اور دہلی کے تقریباً سارے ہی قومی اخباروں نے یہ خبر خاصے

اہتمام کے ساتھ صفحۂ اوّل پر شائع کی تھی۔

ان دنوں نجم الحسن پولینڈ کے سفارت خانے سے کسی نہ کسی طرح متعلق تھے اور انہوں نے لکھنؤ کے اپنے دوستوں کے لیے بھی دعوت نامے حاصل کر لیے تھے، ورنہ بینکوئٹ ہال تو دُور کی بات اشوکا ہوٹل کے آس پاس بھی بھلا اُنہیں کون پھٹکنے دیتا۔

ہال میں دو یا تین بڑی بڑی گول میزیں طرح طرح کے مشروبات، میوہ جات، پھلوں اور فواکہات سے پٹی پڑی تھیں اور حاضرین میں سے زیادہ تر شیشے کے نہایت خوبصورت اور نازک جرعے لیے، دو دو چار چار کے گروپ بنائے ہوئے، باتیں کر رہے تھے، مسکرا رہے تھے اور بعض خاموش تھے، گم سم، جیسے اُنہیں خود کو نمایاں کرنے اور اپنی موجودگی کا احساس دلانے سے زیادہ نشہ بقدرِ ظرف کی لاج عزیز ہو۔ اُن میں سے بعض تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دو چار خشک میوے بھی چُگ لیتے لیکن زیادہ تر ایسے تھے جنہیں کسی غیر کی شرکت بھی گوارا نہ تھی اور وہ شبِ فرقت کو شامِ ملاقات بنانے پر گویا اِسی شرط پر تیار ہوئے تھے کہ بس وہ ہوں گے اور جام و مینا۔

نشہ لوگوں کے چہروں پر بول رہا تھا اور فضا میں ایک کیفیت تھی، ہلکے ہلکے سرور کی، خود کو تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی بھول جانے کی خواہش کی اور اس سے وہ بھی کچھ کچھ سرشار معلوم ہوتے تھے جنہوں نے نہ جام کو ہاتھ لگایا تھا نہ مینا کو اور نہ جن میں آگ کو پانی کر کے پی جانے کا حوصلہ ہی تھا۔ ایسے ہی بمشکل تیس چالیس لوگوں میں مَیں بھی تھا۔

جی چاہا کہ آتشِ نمرود میں، بے خطر ممکن نہ ہو تو دھڑ کتے ہوئے دل کے ساتھ ہی سہی، ایک بار کود کے تو دیکھوں۔ خود کو مجتمع کیا، آگے بڑھا لیکن ہمّت نے ساتھ چھوڑ دیا اور خشک میووں کے دو چار دانے اُٹھا کر بھیڑ میں گم ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے خود کو دوبارہ میز کے قریب پایا اور ایک جام جو کسی یک آتشہ یا دو آتشہ سے تقریباً لبریز تھا، اُٹھا ہی لیا۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی اس میں برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈالے اور ایک ایسی جگہ جہاں بھیڑ ذرا کم تھی خود کو خود سے چھپائے ہوئے جا کھڑا ہوا اور دو تین چُسکیاں لیں۔ ہلکی سی کڑواہٹ، جو نا گوار ہرگز نہ تھی،

ایک اجنبی سی بو، اور لذّت کے احساس نے ذرا کی ذرا میں شرابور کر دیا لیکن اس میں محفل کی فضا کا دخل بھی کچھ کم نہ تھا۔ آٹھ دس منٹ بعد جب مشروب ساغر کی تہہ تک پہنچنے ہی کو تھا کہ گلاس چھلکا یا میں لہرایا اور اوپر والی جیب کے پاس میری شارک اِسکن کی بوشرٹ پر ایک لمبی سی لکیر بن گئی۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ شراب نے اب مجھے پینا شروع کر دیا ہے، کسی قدر غیر متوازن قدموں سے چل کر گلاس پاس کی ایک چھوٹی سی میز پر رکھ دیا۔ لیکن انگور کی بیٹی اپنا کام کر چکی تھی۔

اُسی وقت مجھے احساس ہوا کہ پاس کا ایک کھمبا، جو ہے تو دوسرے کھمبوں کی طرح بے حد خوبصورت، اُن سے کسی قدر چوڑا معلوم ہو رہا ہے۔ اپنے اِس خیال کی تصدیق کے لیے میں اُس طرف بڑھا تو پاس جا کر ہوش ہی اُڑ گئے۔ کھمبے سے ٹیک لگائے، اور گلاس ہاتھ میں لیے ایم۔ سی کھڑے تھے۔

''کانگریچولیشنس'' اُنہوں نے کچھ ایسی آواز میں کہا جو ریڈیائی مقابلہ کی کامیابی کے پس منظر کے سبب ہی سمجھ میں آ سکی۔

''تھینک یو ویری مچ'' میں یہ چار الفاظ بمشکل ادا کر سکا کہ ایک تو دِماغ اور زبان ہم آہنگ نہ تھے اور دوسرے اِس احساس نے کہ ایم۔ سی نے میرے ہاتھ میں گلاس ضرور دیکھا ہوگا حواس باختہ کر دیا تھا۔

اُن دنوں میں قومی آواز میں سب ایڈیٹر تھا، اور خاصا جونیر۔ ایم۔ سی میرے باس نہیں تھے لیکن ایسوشی ایٹیڈ جرنلس (جس کے تحت قومی آواز بھی شائع ہوتا تھا) کے کسی کارکن کے بارے میں ان کی پسند و ناپسند دُور رس نتائج کی حامل ہو سکتی تھی۔ ان کے لمبے چوڑے جسم، لیے دیے رہنے کے انداز، تقریباً سمجھ میں نہ آنے والی آواز اور شکل و صورت نے ان کی شخصیت کا جو تصوّر قائم کر دیا تھا اس میں کسی حسنِ ظن کی گنجائش مشکل ہی سے نکل سکتی تھی۔ خوف کی ایک لکیر دماغ سے شروع ہو کر ریڑھ کی ہڈی سے ہوتی ہوئی، تلووں تک دوڑ گئی۔

ایسوشی ایٹیڈ جرنلس میں ایم۔سی کو کئی بار دیکھا تھا اور اُن سے ملاقات کرنے اور ان کی آواز سننے کا ایک موقع کئی برس قبل اس وقت ملا تھا جب کامریڈ ازدھ گپتا، کرشنانند، جواہر اور خدیجہ انصاری کے ساتھ اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے اُن سے ملا تھا، طلبہ کی اس تنظیم کی ریاستی یا ضلعی کانفرنس کا افتتاح کرنے کی درخواست لے کر۔ ایم۔سی کو اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے مقاصد سے تو اتفاق تھا لیکن اُنہوں نے ہماری تجویز یہ کہتے ہوئے نامنظور کردی تھی کہ بطور ایڈیٹر کسی سیاسی یا نیم سیاسی تنظیم کی کانفرنس کا افتتاح کرنا ان کے لیے مناسب نہ ہوگا۔

ایم۔سی قیصر باغ چوراہے کی نیشنل ہیرالڈ، قومی آواز اور نوجیون کی شاندار عمارت کی پہلی منزل کے زینے کے دوسرے سرے کے تقریباً کنارے کے ایک بڑے سے کمرے کی جانب جاتے یا وہاں سے نکل کر زینے کی طرف بڑھتے تو جو جہاں ہوتا وہیں کھڑا رہ جاتا یا ممکن ہوتا تو کسی کونے کھدرے میں خود کو چھپالیتا۔ گردن جھکائے، پتلون کی جیبوں میں اِس طرح ہاتھ ڈالے جیسے وہ اُسے سنبھالے ہوئے ہوں، ایم۔سی شاید اپنے جسم کے بوجھ کے سبب دھیرے دھیرے چلتے تو ان کی چپل کے فیتے جو ہمیشہ کھلے رہتے، ایک عجیب سی آواز پیدا کرتے۔ اس سب میں ایسا کچھ بھی نہ تھا جس سے کسی کے دل میں ڈر پیدا ہو لیکن جانے کیا تھا کہ اُنہیں دیکھ کر خوف محسوس ہوتا۔ انہیں جس نے بھی دُور سے ایک آدھ بار یا کئی بار دیکھا ہوگا شاید یہ خوف ہمیشہ اس کے ذہن میں بسا رہے لیکن جس نے اُن کو قریب سے دیکھا اور بار بار دیکھا وہ اس نتیجہ پر ضرور پہنچے گا کہ ایم۔سی ویسے ہرگز نہ تھے جیسے نظر آتے تھے۔

پنڈت نہرو سے وابستگی کے سبب نیشنل ہیرالڈ اور ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کے باقی دونوں اخباروں کو کسی نہ کسی طرح کانگریس سے متعلق سمجھا جاتا تھا لیکن ایم۔سی کو ان کے بائیں بازو کے رُجحانات کے پیشِ نظر، کمیونسٹ بھی اپنا ہی سمجھتے تھے اور ان کے قریب ترین دوستوں میں ڈی۔پی مکھرجی، ڈاکٹر علیم، ڈاکٹر زیڈ۔اے۔احمد، پی۔سی جوشی اور احتشام حسین ایسے دانش ور

اور مفکر شامل تھے، ان کے علاوہ قومی آواز کے اس وقت کے اسسٹنٹ ایڈیٹر عشرت علی صدیقی، گیری انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر ویر بہادر سنگھ، آل احمد سرور، ڈاکٹر ایس کے نرائن اور راجہ بخشی بھی ان کے خاصے قریب تھے اور ان میں سے بیشتر کمیونسٹ تھے یا اُن کے ہم خیال۔

اس وقت کے ہندوستان کے بین الاقوامی شہرت کے مالک ایڈیٹر کو جس کے اِداریوں کے سبب اقوام متحدہ میں کسی ہندوستانی اخبار کا ذکر نیشنل ہیرالڈ سے زیادہ نہ ہوتا، اشوکا ہوٹل کے ہال میں اس طرح الگ تھلگ کھڑے دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا۔ لیکن اس کا ایک پس منظر بھی تھا۔

جمہوری طور پر منتخب ہونے والی دُنیا کی پہلی کمیونسٹ حکومت، تعلیمی بل کے خلاف عیسائیوں بلکہ چرچ کی ایک زبردست اور پرتشدد تحریک کے بعد، برخاست کی جاچکی تھی۔ نمبودری پد حکومت کے خلاف اور تحریک کی حمایت میں نیشنل ہیرالڈ نے کئی اداریے لکھے تھے اور مشہور یہ تھا کہ کابینہ کے جلسہ میں پنت جی نے ان اِداریوں کے تراشے پنڈت نہرو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا ''آپ کہہ سکتے ہیں بڈھا پنت رجعت پسند ہے لیکن دیکھیے یہ نوجوان کیا کہہ رہا ہے'' اور عام خیال یہ بھی تھا کہ کیرالا کی کمیونسٹ حکومت کی برخاستگی میں ان اداریوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس واقعہ نے ایم۔ سی کو ترقی پسندوں اور کمیونسٹوں سے الگ تھلگ کر دیا تھا۔ اِس بھری محفل میں اُن کے تنہا نظر آنے کا یہی پس منظر تھا۔

دہلی سے واپسی کے بعد قومی آواز گیا تو عشرت صاحب نے کہا ''ایم۔ سی تم سے ملنا چاہتے ہیں''

اوپر کی سانس اوپر، نیچے کی نیچے رہ گئی۔

تقریباً کانپتے قدموں سے عمارت کے اس حصّے میں گیا جہاں نیشنل ہیرالڈ کا دفتر تھا تو معلوم ہوا کہ ملاقات کے لیے اُن کے پرسنل سکریٹری گلاب رائے سریواستوا سے ملنا ہوگا۔ مسٹر سریواستوا سے ملا، مدّعا بیان کیا۔ انہوں نے کہا تو نہیں لیکن چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ کہیں

کچھ گڑ بڑ ضرور ہوا ہے ورنہ ''قومی آواز'' کے ایک جونیئر سب ایڈیٹر کو ایم۔سی بھلا کیوں بلائیں گے۔ پھر بھی، شاید میرا دل رکھنے کے لیے، وہ ایم۔سی کے کمرے میں گئے اور فوراً ہی کسی قدر شرمندہ شرمندہ سے واپس آئے اور مجھے ان کے کمرے میں پہنچا کر لوٹ گئے۔

چَلپَتِ راؤ کو اُن کے کمرے میں دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ میں اُن کے سامنے خاموش کھڑا تھا، چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''سٹ ڈاؤن'' اُنہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

ایم۔سی کا گلا مستقلاً خراب رہتا تھا جس کے سبب مجھ ایسے نوجوان کے لیے جس کی انگریزی بھی کچھ ایسی اچھی نہ تھی، ان کی بات کا مفہوم سمجھنا مشکل ہو جاتا لیکن ان کے جملے کچھ اس قدر مختصر تھے کہ کوئی خاص دقت نہ ہوئی۔ اُنہوں نے انگریزی میں کہا۔

''کیا تم ہمارے ساتھ کام کرنا پسند کرو گے؟''

دِماغ نے اس سوال کو قبول کرنے سے اِنکار کر دیا لیکن کچھ تو کہنا ہی تھا چنانچہ میں نے کہا ''سر مجھے انگریزی زیادہ نہیں آتی اور انگریزی اخبار کے کام کا تو۔۔۔۔۔''

''وہ ہم تمہیں سکھا دیں گے''۔ انہوں نے جملے کے پہلے حصّہ پر شاید کوئی خاص توجہ نہ دی اور معمولی سے توقف کے بعد مجھ سے پوچھا۔

''تمہارے سیاسی خیالات کیا ہیں؟''

"I am a committed Leftist" میں نے کہا۔

"What does it mean?" اُن کے چہرے پر ایک طرح کی بے یقینی کی کیفیت تھی۔

"A card - holder" (کمیونسٹ پارٹی کا باقاعدہ ممبر)، میں نے جواب دیا۔

انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور موضوع بدل دیا۔

''بی۔اے اور ایم۔اے میں تم نے جوابات ہندی میں لکھے تھے یا انگریزی میں؟''

''انگریزی میں'' جواب مختصر ہی ممکن تھا۔

''اور مضامین، بی۔اے میں؟

''انگریزی، معاشیات اور فلسفہ''

انہوں نے کسی قدر حیرت سے میری طرف دیکھا۔

بی۔اے میں سب سے مشکل مضامین کا گروپ یہی تھا۔

''اور ایم۔اے؟'' ایم۔سی نے پوچھا۔

''فلسفہ''۔ کہہ کر میں نے ان کے پوچھے بغیر کہا۔

''اور اب پی۔ایچ۔ڈی میں داخلہ لیا ہے۔''

''موضوع؟''

"A J Aiyer, an empericist"

یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اے۔جے۔ائیر کے ساتھ **An empericist** کا اضافہ، جسے ان کے علم پر اشتباہ بھی قرار دیا جا سکتا تھا، انہیں بُرا لگا تھا لیکن اُنہوں نے فلسفہ کے مشہور جرائد **Mind** اور **Thought** میں **Empericism** اور **A.J.Aiyer** پر کئی مضامین کا ذکر کیا، ان کے بارے میں ایک ایک دو دو جملے کہے، مابعد الطبیعات کے مسائل کو بنیادی طور پر زبان کے مسائل قرار دینے والے فکری رُجحان کے بارے میں کچھ نکات اِس سہولت کے ساتھ بیان کیے جیسے وہ کسی یونیورسٹی میں فلسفہ کے استاد ہوں اور میں اُنہیں ایک ٹک دیکھتا رہ گیا۔ انہوں نے ائیر کی مشہور تصنیف **Language, Truth and Logic** کے چند مباحث کا بھی ذکر کیا۔ پھر یکا یک بولے۔

"Now, you may go"

کمرے سے باہر آ کر میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اطمینان کا پہلا سبب یہ خیال تھا کہ پانچ روپے سالانہ کی ترقی کی ایک سو پچھتر روپے ماہانہ کی ملازمت کو اب کوئی خطرہ نہیں تھا

اور دوسرا یہ کہ کمیونسٹ پارٹی سے تعلق ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کی ملازمت میں کسی پریشانی کا سبب نہ بن سکے گا۔ لیکن اس کے علاوہ سرشاری کی ایک کیفیت بھی تھی جو مرہونِ منّت تھی اس احساس کی کہ ایم۔سی نے اس قابل سمجھا کہ تقریباً آدھے گھنٹے تک باتیں کرتے اور سنتے رہے۔

اس وقت نیشنل ہیرالڈ میں ملازمت کی تجویز کو میں نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی لیکن تین چار دن بعد کمپنی کے چیرمین اور مینیجنگ ڈائرکٹر اُما شنکر دیکشت نے مجھے بُلا کر مطلع کیا کہ تمہاری ملازمت ''قومی آواز'' سے نیشنل ہرالڈ منتقل کردی گئی ہے۔ تاہم یہ بیل منڈھے چڑھی چھے سوا چھے ماہ بعد کیوں کہ حیات اللہ صاحب نے مجھے فوری طور پر ''رہائی'' دینے سے انکار کردیا تھا۔ ان چھے مہینوں میں ''قومی آواز'' میں کام کرنے کے علاوہ تین چار گھنٹے روزانہ ہیرالڈ میں کام سیکھتا رہا۔ چیف سب ایڈیٹر کرپلانی اور ورما مجھے ٹیلی پرنٹر کی ایسی چھوٹی چھوٹی خبریں دے دیتے جو انہیں شائع نہ کرنی ہوتیں اور پھر اپنا کام ختم کرنے کے بعد انہیں دیکھتے اور غلطیوں کی نشاندہی کرتے۔

اس وقت کے دُوسرے اخباروں کے بارے میں مجھے نہیں معلوم، لیکن ''نیشنل ہیرالڈ'' کا حال یہ تھا کہ اس کے اِدارتی عملہ میں شامل ہونے والا اپنی قسمت پر ناز کرسکتا تھا۔ ہیرالڈ کی تربیت کا ہی نتیجہ ہے کہ لکھنؤ کے تین انگریزی اخباروں ـــ ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس اور انڈین ایکسپریس ـــ کے ایڈیٹر، ریزیڈینٹ ایڈیٹر اور انچارج (اتل چندرا، سنیتا ایرن اور راج سرن ورما، بالترتیب) وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی صحافتی زندگی کا ابتدائی زمانہ نیشنل ہیرالڈ میں گزارا تھا۔

چند ہی دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ اِدارہ کا کوئی رُکن کسی دوسرے اخبار (انگریزی میں اس لفظ کے معنی میں جرائد بھی شامل ہیں) میں نہیں لکھ سکتا۔ میں محکمۂ اطلاعات کے ماہنامہ ''نیا دور''، انگریزی ماہنامہ ''اترپردیش'' اور ''آج کل'' وغیرہ میں افسانوں کے علاوہ ادبی موضوعات اور ہندوستانی فلسفہ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھا کرتا تھا، اس لیے اس اطلاع

سے مجھے خاصی پریشانی ہوئی اور میں نے ایک چند سطری خط ایم۔سی کو لکھا اور اُن سے درخواست کی کہ میرے مضامین غیر سیاسی نوعیت کے ہوتے ہیں اس لیے براہ مہربانی مجھے یہ سلسلہ جاری رکھنے کی اجازت دی جائے۔ خط لے کر خود ایم۔سی کے پاس جانے کی ہمت نہ ہوئی تو گلاب رائے سریواستوا کی مدد لی۔ اگلے دن اُنہوں نے خط واپس کرتے ہوئے اجازت ملنے پر مبارکباد دی۔ ایم۔سی نے اسی خط پر لکھ دیا تھا۔

Yes Abid, you may continue to write on literary and philosophical subjects, but I hope you will sell the articles, not yourself.

M.C.

آج کی صحافتی دُنیا میں ایم۔سی کا مشورہ اور خواہش دُور سے آتی ہوئی آواز ضرور محسوس ہوگی لیکن ساتویں دہے کہ آخر تک، کم سے کم نیشنل ہیرالڈ میں صحافیوں سے اسی معیار کی توقع کی جاتی تھی اور وہ اس پر پورے بھی اُترتے تھے۔

ورما اور کرپلانی ایسے چیف سب ایڈیٹروں اور گوڑ صاحب اور اے۔ کے۔ ورما ایسے سینئر سب ایڈیٹروں کے علاوہ ہیرالڈ کے رپورٹروں میں لکشمی کانت تواری اور صلاح الدین عثمان شامل تھے جن کی غیر جانب داری، ایمانداری اور خبروں کی معروضیت کا پوری صحافتی برادری میں چرچا تھا۔ سائیکل ہی سارے رپورٹروں کا ذریعہ، آمدورفت تھی، اگرچہ اسکوٹر بازار میں آچکے تھے اور ہزار ڈیڑھ ہزار روپوں میں مل جاتے تھے۔ رہی کار تو اس کا تصوّر تک پائنیر کے ایڈیٹر کے علاوہ بڑے سے بڑے صحافی کے لیے ممکن نہ تھا۔ خود ایم۔سی پہلے کپورس، بعد میں بھوپال ہاؤس (لال باغ) اور آخر میں پارک روڈ کے مکان سے رکشے پر دفتر آتے تھے۔

ان دنوں مے فیئر اور کیپیٹل سینما گھر انگریزی فلموں کے لیے وقف تھے اور نئی فلم لگنے

سے قبل اتوار کو دن کے گیارہ بجے صحافیوں کے لیے ان کے Previews ہوتے تھے اور ہر اخبار کے ایڈیٹر کو دو پاس بھیجے جاتے تھے۔ یہ مفت شو دیکھنے ایم۔سی تو شاید کبھی نہیں گئے اور ہیرالڈ سے صرف ایک ہی شخص اس پاس سے مستفیض ہو پاتا کیوں کہ دوسرا پاس پھاڑ کے پھینک دیا جاتا تھا۔ جب کہ ایک دوسرے انگریزی اخبار سے متعلق لوگ ان دو پاسوں کے سہارے پورے پورے خاندان کو فلم دکھانے لے جاتے تھے۔

نیشنل ہیرالڈ کے تینوں ایڈیشنوں کی مجموعی تعداد اشاعت ستائیس اٹھائیس ہزار سے زائد نہ تھی لیکن حلقۂ اثر اور اعتماد کا جہاں تک تعلق ہے شہر اور ریاست کیا پورے ملک میں اس کا کوئی حریف نہ تھا۔

۱۹۴۲ء میں ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک کے جلو میں جب ''ہیرالڈ'' کی اشاعت کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو دلاور حسین (مرحوم) نے ایک فلمی ہفت روزہ کی بنیاد ڈالی جس میں کبھی کبھی ایم۔سی بھی لکھا کرتے تھے۔ اسی مناسبت سے وہ آخر دم تک انہیں ''مائی ایڈیٹر'' کہتے رہے۔ دلاور صاحب شاید واحد سب ایڈیٹر تھے جو ایم۔سی کے کمرے میں پچیس تیس منٹ بیٹھ سکتے تھے ورنہ ادارہ کے کسی دوسرے رُکن میں نہ اس کی ہمت تھی اور نہ ایم۔سی یہ پسند ہی کرتے تھے۔

تقریباً ۱۹۷۰ء تک ''راج بھون نیوز'' کے عنوان سے ایک خبر ہر انگریزی اخبار میں روزانہ تیسرے صفحہ پر شائع ہوتی تھی جس میں گورنر سے ملاقات کرنے والے ہر شخص اور گورنمنٹ ہاؤس کے ہر مہمان کے آنے اور رخصت ہونے کی اطلاع شائع ہوتی تھی۔ ایک دن دلاور صاحب ایم۔سی کے کمرے میں کچھ زیادہ ہی دیر بیٹھے تو انہوں نے کہا۔

"Well, My Editor, if I were Governor, the Raj Bhawan News would only say Dilawar Husain came------"

گوپالا ریڈی نے جو ایم۔سی کے بچپن کے دوست تھے، کئی بار یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اُن سے ملاقات کرلیں اور کار تک بھیجنے کی پیش کش کی لیکن ایم۔سی ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا

دیتے۔ آخر جب اصرار بہت بڑھا اور اس میں دیرینہ تعلقات کا حوالہ بھی شامل ہو گیا تو چلپتِ راؤ راضی ہو گئے لیکن دو شرطوں پر۔ ایک یہ کہ ''راج بھون نیوز'' میں اُن کا نام نہیں آئے گا اور دوسری یہ کہ اُن کو لانے اور واپس پہنچانے کے لیے سرکاری گاڑی نہیں بھیجی جائے گی۔ چنانچہ وہ رکشہ پر راج بھون گئے، جہاں صدر دروازہ پر گوپالا ریڈی اُن کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ نہ کسی رجسٹر میں اُن کے نام کا اندارج ہوا اور نہ کہیں اُنہیں دستخط کرنے پڑے اور نہ ''راج بھون نیوز'' میں اُن کا نام آیا۔

گورنمنٹ ہاؤس کی بات نکل آئی ہے تو اس سلسلے کا ایک دلچسپ واقعہ بھی کیوں نہ بیان کر دیا جائے۔

ریاستی گورنر سر ہومی مودی کی جانب سے عشائیہ کا دعوت نامہ لے کر گورنمنٹ ہاؤس کا ایک کارندہ آیا، سرکاری گاڑی پر۔ دعوت نامے اخباروں کے دفتر میں آیا ہی کرتے ہیں لیکن اس دعوت نامے کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے وصول ہونے کی رسید بھی دینی تھی، ایک رجسٹر پر دستخط کر کے۔ گلاب رائے ایم۔ سی کی اجازت کے بغیر دعوت نامے کی رسید دینے کی ہمت نہ کر سکے اور اسے لے کر ان کے کمرے میں گئے۔ لفافہ پر لکھا تھا۔ Mrs and Mr Chhalapati Rao۔ ایم۔ سی دعوت نامہ لفافے سے دھیرے دھیرے نکالتے ہوئے اس کی عبارت پڑھتے رہے۔ دعوت نامہ کے بالکل نیچے کسی قدر باریک حروف میں لکھا تھا Please come in dinner suit ۔ یہ عبارت پڑھتے ہی ان کے چہرے پر ناگواری کا تاثر چمک اُٹھا اور انہوں نے کارڈ دھیرے دھیرے لفافے میں رکھنے کے بعد مسز اور مسٹر چلپت راؤ کی عبارت کے نیچے لکھ دیا۔

So far as Mrs Chhalapati Rao is concerned, she does not exist, and Mr Chhalapati Rao does not have a dinner suit.

اور یہ بتانے کی اب مشکل ہی سے ضرورت رہ جاتی ہے کہ گورنمنٹ ہاؤس کا دعوت نامہ واپس کر دیا گیا۔

نیشنل ہیرالڈ کی سلور جبلی کے موقعہ پر سفید بارہ دری سے ملحق پارک میں ایم۔سی کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا جس کے مہمانِ خصوصی پنڈت نہرو تھے۔ پنڈت نہرو نے اپنی تقریر کے دوران یہ کہتے ہوئے کہ ''لوگ کہتے ہیں نیشنل ہیرالڈ میرا اخبار ہے۔ یہ بالکل غلط ہے، ہیرالڈ دراصل ایم۔سی کا اخبار ہے'' بائیں جانب مڑکر دیکھا تو ایم۔سی موجود نہ تھے۔ اُنہوں نے تقریر روک کر کئی بار اُنہیں پکارا تو چوتھی صف سے ایم۔سی اُٹھے، حسبِ عادت دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اسٹیج پر آئے تو حاضرین نے زوردار تالیاں بجائیں۔ پنڈت نہرو نے اپنی تقریر کے تار جوڑے، جنگ آزادی میں نیشنل ہیرالڈ کی خدمات کا ذکر کیا اور ملک کے مستقبل کے بارے میں اپنے خوابوں سے سامعین کے دل و دماغ میں جگنوؤں کی روشنیاں بکھیر دیں۔ سامعین پنڈت نہرو کی تقریر کے سحر سے بیدار ہوئے اور اُن کی نظر اسٹیج پر پڑی تو ایم۔سی کی کرسی پھر خالی تھی۔

ایم۔سی اور پنڈت نہرو کے درمیان فکری ہم آہنگی کا حال یہ تھا کہ ہندوستان پر چین کے حملہ کی خبر آتے ہی ایم۔سی نے غالباً A Friend's Treachery کے عنوان سے اداریہ لکھا اور رات میں پنڈت نہرو نے ریڈیو سے قوم کو خطاب کیا۔ اگلے دن اخبار میں جب پنڈت نہرو کی تقریر اور ایم۔سی کا اداریہ ساتھ ساتھ پڑھے گئے تو نہ صرف خیالات کی ہم آہنگی بلکہ متعدد جملوں کی تقریباً یکسانیت پر لوگ حیران رہ گئے۔

ایک بار پنڈت نہرو نے بیگم حضرت محل پارک میں جلسۂ عام کو خطاب کرنے کے بعد گاڑی گورنمنٹ ہاؤس کے بجائے قیصر باغ کی طرف مڑوادی اور کسی اطلاع کے بغیر ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کی سابقہ عمارت میں نل اور بیل کے درخت کے پاس کار سے اتر کر تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے ایم۔سی کے کمرے میں داخل ہوگئے۔ قوی الجثہ چلپتِ راؤ میز پر پیر پھیلائے ہوئے دہلی کا کوئی اخبار پڑھ رہے تھے۔ کمرے میں کسی کے داخل ہونے کا احساس ہوتے ہی انہوں نے اخبار آنکھوں

کے سامنے سے ہٹایا۔ میز کی دوسری جانب پنڈت نہرو بیٹھے تھے۔ ''آہ، آہ'' کہتے ہوئے ایم۔ سی نے اپنی ٹانگیں تیزی سے ہٹانے کی کوشش کی تو پنڈت نہرو نے کہا **M. C., take it easy, take it easy.**

نیشنل ہیرالڈ کے ادارتی عملے کے وہ لوگ جو اس وقت ڈیوٹی پر تھے اور پنڈت نہرو کی آمد کی خبر سن کر ایڈیٹر کے کمرے کے آس پاس جمع ہو گئے تھے، دھیرے دھیرے منتشر ہو گئے اور پھر تقریباً آدھ گھنٹہ تک دونوں کے درمیان کیا بات چیت ہوئی یہ تو کسی کو نہیں معلوم لیکن بہتوں نے دیکھا کہ ایم۔ سی ملک کے وزیر اعظم کو اپنے کمرے کی چق تک چھوڑنے آئے اور بس۔

یہ تھے پنڈت نہرو اور یہ تھے ایم چلپتِ راؤ۔

شاید ہی کسی دفتر کے بارے میں کہا جا سکتا ہو کہ وہ گروپ بازی اور سیاست سے پاک ہے۔ یہی حال ہیرالڈ کا بھی ہو گیا تھا۔ لیکن یہ علّت زیرِ آب تھی اور مجھ ایسے نو وارد کے لیے سطحِ آب پر اُن سے پیدا ہونے والے ارتعاشات تک کا احساس کرنا ممکن نہ تھا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ادارتی عملہ کے تقریباً سارے اہم افراد، جن میں دونوں چیف رپورٹر صلاح الدین عثمان اور لکشمی کانت تواری، دونوں چیف سب ایڈیٹر کرپلانی اور ورما، آدرش کمار ورما، جن سے ایم۔ سی کبھی کبھی اداریے بھی لکھواتے تھے، اسپورٹس رپورٹر وادھوانی اور دو سینئر سب ایڈیٹر شامل تھے، نیوز ایڈیٹر بپٹسٹا (Baptista) کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ نیوز ایڈیٹر کو فوراً برطرف کر دیا جائے۔ ایم۔ سی خود بھی بپٹسٹا کے کام اور اسٹاف کی جانب اُن کے رویّہ سے خوش نہ تھے لیکن دباؤ ڈال کر اُن سے کبھی کچھ نہیں کرایا جا سکتا تھا۔ آخر چند دنوں بعد ادارتی عملہ کے آٹھ سینئر اراکین نے استعفیٰ دے دیا اور لکشمی کانت تواری نے یو پی ورکنگ جرنلسٹ یونین کے صدر کی حیثیت سے یہ استعفے اپنے خط کے ساتھ ایم۔ سی کو بھیج دیے۔ ایم۔ سی نے یہ آٹھوں استعفے، اور لکشمی کانت کے خط کو بھی استعفیٰ تسلیم کرتے ہوئے، منظور کر لیے اور اُن سب کو اخبار کی

ذمہ داریوں سے بلا تاخیر سبک دوش کر دیا۔ شہر کے علمی، ادبی اور صحافت سے متعلق حلقوں میں ان سبکدوشیوں کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ احتجاج کی دو چار آوازیں ضرور بلند ہوئیں لیکن ایم۔ سی کے فیصلے کے خلاف کوئی فضا نہ بن سکی۔

ان نو صحافیوں میں سے بیشتر صحافت کی آبرو اور چند تو ایم۔ سی کے ''جگر پارے'' تھے لیکن تعلقِ خاطر اپنی جگہ، اصول اپنی جگہ۔ دونوں کے اپنے اپنے مقام اور اپنے اپنے تقاضے تھے، اُنہیں ملایا نہیں جا سکتا تھا۔ ان استعفوں سے خود ایم۔ سی بے حد ملول اور دل گرفتہ تھے۔ وہ گلاب رائے کو بلاتے اور کبھی صلاح الدین عثمان کو طلب کرتے، کبھی لکشمی کانت کو، کبھی کرپلانی کو اور کبھی ورما کو۔ گلاب رائے خاموش کھڑے رہتے تو اُنہیں ہاتھ کا اشارہ کر کے واپس کر دیتے۔۔۔۔ لیکن اصولوں کے سلسلے میں سمجھوتہ کرنے پر خود کو آمادہ نہ کر پاتے۔

پنڈت نہرو کا خواب ہونے کے باوجود، جسے رفیع احمد قدوائی نے عملی شکل دی تھی، نیشنل ہیرالڈ بڑی حد تک غیر جانبدار اور آزاد اخبار تھا۔ اِدارہ کے تینوں اخباروں کی پالیسی کے تعیّن کے سلسلے میں مداخلت کا اختیار نہ وزیر اعظم کو تھا نہ صدر کانگریس کو۔ حد یہ ہے کہ کانگریس کی مجلسِ عاملہ تک اس معاملے میں قطعاً بے اثر تھی۔ اگر چہ ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کے میمورینڈم کے پالیسی کے خانے میں ''آل انڈیا کانگریس کمیٹی'' درج تھا لیکن پارٹی کی دو تین ریاستی حکومتوں اور چند لیڈروں کے کردار و گفتار کے باوصف اے۔ آئی۔ سی۔ سی کی غالب اکثریت پر مذہبی رواداری، جمہوریت اور سوشلزم کا رنگ چھایا ہوا تھا اور ان اصولوں کی توجیہ کے سلسلے میں پنڈت نہرو اور ایم۔ سی کے اندازِ فکر میں کچھ ایسی ہم آہنگی تھی کہ نتائج تقریباً ہمیشہ ہی ایک سے برآمد ہوتے۔ چنانچہ نیشنل ہیرالڈ اُردو کی حمایت اور اقلیتوں کے مطالبوں کے سلسلے میں ہمیشہ سینہ سپر رہتا۔ قومی آواز تو خیر اُردو کا اخبار تھا ہی، نوجیون تک نے اُردو کے مطالبات کو کبھی ترچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔

ایم۔ سی کانگریسی حکومتوں کی کھل کر نکتہ چینی کرتے۔ **Alibi** کے عنوان سے ان کا

اداریہ جس کا پہلا جملہ کچھ یوں تھا۔

"The UP government continuing from budget session to budget session..."

.........اُس وقت کے وزیر اعلیٰ کو سخت نا گوار گذرا اور اُنہوں نے پنڈت نہرو سے شکایت کی لیکن پنڈت جی نے یہ کہتے ہوئے کہ میں نیشنل ہیرالڈ کے معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتا، اُنہیں خاموش کر دیا۔ ایک دوسری وزیر اعلیٰ تو جنہیں ہیرالڈ کے اداریے نے اتر پردیش میں کانگریس کی Undertaker گردانا تھا ایم۔سی کی شکایت تک نہ کر سکیں اور پیچ و تاب کھا کے رہ گئیں۔ پالیسیوں اور ان کے عمل درآمد پر نکتہ چینی صرف ریاستی حکومتوں تک محدود نہ تھی، ایم۔سی مرکزی حکومت کو بھی نہ بخشتے لیکن پنڈت نہرو کے سلسلے میں اس کی نوبت ہی نہ آتی یا........

ہنگامی حالات کے دوران ہیرالڈ کے سرِ نامہ سے پنڈت نہرو کے مقولے "Freedom is in peril, defend it with all your might" کے غائب ہو جانے یا کر دیے جانے کے باوجود، اخبار کے بانکپن میں فرق نہ آیا۔ اندرا گاندھی کے دورِ اقتدار میں ایک بار لکھنؤ سے لوک سبھا کے لیے کانگریس نے اپنے اُمیدوار کے طور پر ایک بہت بڑے صنعت کار کا انتخاب کیا۔ ایم۔سی کو ان سے کسی قسم کی ذاتی رنجش نہ تھی، لیکن وہ سیاست میں صنعت کاروں اور دولت کے داخلے کے خلاف تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے اس فیصلہ کے خلاف نہایت سخت اداریہ لکھا جس کا ایک جملہ شاید کچھ اس طرح تھا "Money corrupts much more than power corrupts"۔ لیکن کچھ نہ ہوا۔

شہر میں کانگریس کی انتخابی مہم کی خبریں ہیرالڈ میں شائع ضرور ہوتیں لیکن شہریوں اور کمیونسٹ پارٹی کے حمایت یافتہ آزاد امیدوار پنڈت آنند نرائن ملاّ کے جلسوں جلوسوں کی رودادیں زیادہ جگہ پاتیں، زیادہ آن بان سے شائع ہوتیں اور رفتہ رفتہ نیشنل ہیرالڈ ایک طرح سے آنند نرائن ملاّ کا ترجمان بن گیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اسی ادارے کے باقی دو اخبار

کانگریس کے امیدوار کی حمایت کر رہے تھے۔

اسی دوران ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ کانگریسی امیدواروں کی حمایت میں حسبِ دستور اندرا گاندھی نے اشتہار کی شکل میں ایک اپیل جاری کی۔ پورے صفحہ کے اس اشتہار میں اپیل کے الفاظ تو وہی رہتے بس حلقہ انتخاب کی مناسبت سے امیدوار کا نام تبدیل ہو جاتا۔ یہ اشتہار ملک کے مختلف اخبارات میں شائع ہوئے۔ اتر پردیش کے متعدد حلقہ ہائے انتخاب کے سلسلے میں کانگریس کے پورے صفحہ کے یہ اشتہار نیشنل ہیرالڈ میں بھی شائع ہوئے لیکن وی۔ آر۔ موہن کی حمایت میں اشتہار آیا تو متعلقہ محکمہ کے منیجر کی ہمت نہ ہوئی کہ ایم۔ سی کی منظوری کے بغیر اسے شائع کریں۔ چنانچہ انہوں نے پہلے سے وقت لے کر ایم۔ سی سے ملاقات کی اور اشتہار کا مسوّدہ جوں ہی اُنہیں دکھایا انہوں نے اس کا گولا بنا کر ردّی کی ٹوکری میں پھینکتے ہوئے کہا "How can an advertisemenet against the policey of the paper find place in it?" ۔ چنانچہ اس وقت کے تیس ہزار روپوں کا یہ اشتہار نیشنل ہیرالڈ میں شائع نہ ہو سکا لیکن قومی آواز اور نوجیون میں ضرور چھپا۔

کچھ اسی طرح کی صورتِ حال ریاست کے سرکاری ملازمین کی طویل ہڑتال کے دوران بھی پیش آئی۔ ہڑتال کی مخالفت میں اور اسے غیر ضروری اور مفادِ عامّہ کے خلاف ثابت کرنے کے لیے سرکاری اشتہارات ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کے باقی دو اخبارات میں شائع ہوتے رہے لیکن انہیں ہیرالڈ میں جگہ نہ مل سکی، کیوں کہ وہ ملازمین کے مطالبات کو جائز سمجھتا تھا۔

صحافت کی آزادی کے ایک معنی شاید یہ بھی ہیں۔ لیکن افسوس اب اس میں سے بہت کچھ داستانِ پارینہ بن چکا ہے۔

نیشنل ہیرالڈ میں ایک لاگ بک بھی ہوتی تھی جس میں اخبار سے متعلق ہر طرح کی غلطی کی نشاندہی کی جاتی تھی۔ غلطی سنگین ہوتی تو شعبۂ ادارت کے متعلقہ رکن کو تند و ترش خط بھی

ملتا، جسے ہم لوگ Love letter کہتے تھے۔ ایسے ہی ایک معاملہ کے نتیجہ میں میری ملازمت تک جا سکتی تھی لیکن محض اتفاق سے سازش پر سے پردہ اُٹھ گیا اور اپنے کمرے میں بلا کر ایم۔سی نے مجھ سے کہا "You must hav been pained for no fault of yours" اور پھر میری دلجوئی کے لیے اپنی میز کی دراز سے بہت سے سگار نکال کر دیے۔ یہ سگار ان کے ایک دوست ہوانا سے لائے تھے۔ میں نے یہ تحفہ ایم۔سی سے آنکھیں ملائے بغیر قبول کیا تھا کیوں کہ اُن کے سامنے میں نہ پائپ پیتا تھا، نہ سگار۔

لاگ بک کے چند اندراجات اب تک یاد ہیں۔

کھیل کے صفحہ کی ایک خبر میں ایک کاما کے سلسلے میں اُنہوں نے لکھا تھا۔

"Not wrong, but not necessary"

ایک دن اُسی صفحہ کی ایک خبر کے تراشے میں زبان و بیان کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے کے بعد اُنہوں نے لکھا تھا۔

"No sub-editor can survive in any good daily with this sort of subbing"

ایک دن پائنیر اور نیشنل ہیرالڈ میں ایک ہی تصویر صفحہ اوّل پر شائع ہوئی۔ ہیرالڈ میں اس تصویر کے نیچے کی عبارت تقریباً تین سطروں کی تھی جب کہ پائنیر میں سب کچھ دو سطروں میں کہہ دیا گیا تھا، اور وہ بھی بہتر طریقے سے اور زیادہ اطلاعات کے ساتھ۔ لاگ بک میں دونوں تصاویر کے تراشے ساتھ ساتھ چپکوانے کے بعد ایم۔سی نے لکھا تھا

"The two lines of the Pioneer tell much more than our three lines"

اس سلسلے میں میرے ساتھ پیش آنے والے ایک معاملہ کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

ایک ایسے رپورٹر نے، جو انگریزی کے ایک قومی اخبار سے اپنے پندرہ سالہ تعلق کے

طفیل ایک نازک وقت میں ہیرالڈ کے ادارتی عملہ میں شامل ہو گئے تھے (بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ پندرہ برسوں تک اُس اخبار کے شعبۂ اشتہارات سے متعلق تھے) گنگا پرشاد میموریل ہال کے ایک جلسے کی رپورٹنگ کی تھی۔ میری بد قسمتی کہ اس کاپی کو ایڈٹ کرنے کا کام میرے سپرد ہوا۔ ہیرالڈ سے میرا تعلق قائم ہوئے بمشکل دو ڈھائی سال ہوئے تھے اور انگریزی بھی واجبی ہی آتی تھی۔ کچھ تو رپورٹر کے پندرہ سال کے تجربے کی دھونس اور کچھ اپنی نا اہلی، ایڈٹنگ کا حق ادا نہ کر سکا۔ زبان و بیان کی چند غلطیاں ڈرتے ڈرتے درست ضرور کیں لیکن پہلے جملے کو جو پورے پیراگراف کو محیط تھا، چھوٹے چھوٹے دو تین جملوں میں تقسیم کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اگلے دن ایم۔ سی نے اس پیراگراف کا تراشہ لاگ بک میں چپکوایا، اوقاف اور زبان کی ایک آدھ غلطی کی نشاندہی کی اور ایک جملے پر مشتمل خاصے لمبے پیراگراف کے سلسلے میں لکھا۔

"The reporter wrote down a whale of a sentence and the sub-editor gobbled it......."

لکھنؤ یونیورسٹی سے متعلق ایک خبر کا ایک جملہ ہیرالڈ میں اس طرح شائع ہوا تھا۔

"The University statutes lay ...."

ایم۔ سی نے لاگ بک میں لکھا "Lay what? Eggs?"۔ غلطیوں پر ایم۔ سی کے تبصرے کبھی کبھی لطف بھی دے جاتے۔ ایک دن صفحۂ اول کی ایک مختصر خبر میں جو حلقہ میں شائع کی گئی تھی، زبان و بیان کی معمولی سی غلطی راہ پا گئی تو ایم۔ سی نے لاگ بک میں لکھا:

"Care may be taken for the correctness of language even in a box item."

دو ڈھائی سو صفحات کی لاگ بک سال سوا سال میں بھر جاتی تو گلاب رائے اُسے اپنے پاس محفوظ کر لیتے اور اُس کی جگہ دوسری لاگ بک لے لیتی۔

انگریزی صحافت کے اسرار و رموز سکھانے کے لیے درجنوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں

لیکن ان لاگ بکس کے اندراجات کا انتخاب ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا جاتا تو اس کوچے کے باشندے اور انگریزی صحافت کو بطور پیشہ اختیار کرنے کے خواہشمند بیشتر دوسری بہت سی کتابوں سے بے نیاز ہو جاتے۔

افسوس یہ سارا سرمایہ ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کے ایک منیجر نے ردّی میں فروخت کر دیا۔ ویسے اب اس کی ضرورت بھی کیا رہ گئی ہے کہ انگریزی کے مقتدر سمجھے جانے والے روزناموں میں The incident took place at about 3 pm, comprise of, the dispute was solved, the three- day meet will begin from, the matter was disposed off, The party is in shamble, the problem was resolved, ایسے درجنوں گہر پارے برابر ہی نظر آتے ہیں اور little اور a little کا فرق تو جیسے لوگ بھول ہی گئے ہیں۔

نیشنل ہیرالڈ کے ایک رپورٹر کی کاپی ایڈٹ کرنے سے مجھ ایسے جونیر سب ایڈیٹر بہت خوف زدہ رہتے تھے کیوں کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی خبر تیار کرنے میں یہ التزام ضرور رکھتے تھے کہ کوئی بھی جملہ انشاء اور املا کی غلطی سے پاک نہ رہ پائے۔ مبتدا کہیں، خبر کہیں، کبھی دونوں کے درمیان رشتہ غائب اور کبھی ایک دوسرے سے بے حد دور اور ان کے درمیان اتنی صفتیں اور اتنے ضمائر سجے ہوتے کہ اکثر یہ سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا کہ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ اُنہیں جو لفظ جہاں یاد آ جاتا ٹانک دیتے۔ بیپٹسٹا اور گوڑ صاحب جانتے تھے کہ اُن کے جملے سے کون کون سے الفاظ کاٹ دینے ہیں، مبتدا کا خبر سے رشتہ قائم کرنے کے لیے کیسے کیسے خار و خس راستے سے ہٹانے ہوں گے اور یہ بھی کہ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ اگلے دن صفحہ تین پر اپنی خبر دیکھ کر انہیں گمان ہوتا کہ وہ اچھی خاصی انگریزی لکھ لیتے ہیں اور اس خیال کے تحت وہ خبر زیادہ تفصیل سے لکھتے۔ خیر ہمیں اس سے کچھ سروکار بھی نہیں تھا، بیپٹسٹا جانیں یا گوڑ صاحب۔

ہیپٹسٹا ایک مہینے کی سالانہ چھٹی گرمیوں میں لیتے تھے اور اُن میں سے بیشتر دن گوا میں گزارتے تھے۔ اُن کی رُخصت کے درمیان گوڑ صاحب بیمار پڑ گئے۔ ایم۔سی کو ہم لوگوں کی پریشانی کا اندازہ ایک دن کا اخبار دیکھ کر ہی ہو گیا اور اُنہوں نے گلاب رائے سے کہلوایا کہ مقامی خبریں اُنہیں بھیج دی جائیں۔ ہم لوگ ساری ہی مشکل مقامی خبریں اُنہیں بھیجنے لگے۔ ایک دن مذکورہ رپورٹر کی دو صفحات کی خبر اُنہیں بھیجتے ہوئے ہم لوگوں کے چہروں پر ایک طرح کی خبیثانہ مسکراہٹ دوڑ گئی کہ آج ایم۔سی کو معلوم ہو جائے گا کہ کاما، کولن، سیمی کولن اور زبان و بیان کی غلطیوں کی نشاندہی کرنا ایک بات ہے اور اس طرح کی کاپی ایڈٹ کرنا بالکل دوسری۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد گلاب رائے ایڈٹ کی ہوئی کاپیاں لے کر آئے تو ہم نے جلدی جلدی مذکورہ رپورٹر کی کاپی ڈھونڈھی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ دو صفحات کی خبر میں ایم۔سی نے بمشکل آٹھ دس الفاظ کاٹے تھے، تین چار لفظوں کو ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیا تھا اور املا کی چند غلطیاں درست کی تھیں جب کہ ہم جونیر سب ایڈیٹر تو کیا سینئر لوگ بھی اُن کی کاپی سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے تو ہر پیراگراف سرخ پینسل کے نشانوں سے رنگ جاتا۔

اتفاق سے دلاور صاحب میرے پاس ہی کھڑے تھے۔ میں نے کاپی اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "ایم۔سی کو سب انگریزی آتی ہے"

بعد میں اے۔ کے۔ ورما نے گُر کی بات جتائی۔ انہوں نے کہا کہ ہم سب کے ذہن میں زبان کی تعمیر کا ایک مخصوص خاکہ ہوتا ہے اور ہم ہر تحریر کو اُسی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایم۔سی کاپی کی تعمیر کے حدود میں رہتے ہوئے ہی غلطیاں دُرست کر دیتے ہیں۔

ایم۔سی کو واقعی سب انگریزی آتی تھی۔

کرپلانی کو، جو عرصہ ہوا ہیرالڈ چھوڑ چکے تھے، ایم سی بہت عزیز رکھتے تھے اور اُن کی صحافتی صلاحیتوں کے بے حد مداح تھے۔ ہیرالڈ سے جو لوگ مستعفی ہوئے تھے ان میں سے کسی کو

بھی دوسری ملازمت حاصل کرنے میں دقت نہیں ہوئی تھی۔ کرپلانی بھی ایک قومی روزنامہ سے کہیں بہتر مشاہرہ پر متعلق ہو گئے تھے۔ وہاں سب کچھ تھا لیکن ایم۔ سی نہ تھے۔ آخر طبیعت اوب گئی اور سال سوا سال بعد استعفیٰ دے کر کپڑوں کی رنگائی کا خاندانی پیشہ اختیار کرلیا۔ ایم۔ سی کو ان کے فیصلے کا علم ہوا تو یکا یک گم سم سے ہو کر رہ گئے، پھر میز پر رکھا ہوا پیڈ اپنی طرف کھینچا اور اس پر لکھ دیا۔

"Journalism in India is the poorer without Kirpalani"

گلاب رائے نے، یہ کاغذ کرپلانی کو، جن کا پتہ انھیں معلوم تھا، بھیج دیا اور سنا ہے کہ انھوں نے ایم۔ سی کا یہ سرٹیفکٹ جس پر اُن کے دستخط بھی نہ تھے، فریم کرا کے اپنے کمرے کی الماری میں اس طرح رکھ دیا تھا کہ آتے جاتے اس پر اُن کی نظر ضرور پڑ جاتی تھی۔

بعد میں دہلی سے ہیرالڈ کی اشاعت شروع ہوئی تو ایم۔ سی نے نیوز ایڈیٹر کرپلانی ہی کو بنایا۔ لکھنؤ میں ایم۔ سی ہیرالڈ کے سینئر صحافیوں کا مطالبہ تسلیم کر لیتے تو اخبار کے نیوز ایڈیٹر کرپلانی ہی ہوتے۔ معلوم نہیں برسوں بعد نیوز ایڈیٹر کے طور پر کرپلانی کے تقرر کو Poetic justice کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔

لکھنؤ میں نیشنل ہیرالڈ کے اجرا سے غالباً ۱۹۶۰ء تک اخبار کے اسپورٹس رپورٹر دلاور صاحب کے بے حد عزیز دوست محسن نامی ایک صاحب تھے۔

محسن ایسا اسپورٹس رپورٹر شاید ہی دُنیا کے کسی اخبار کو نصیب ہوا ہو۔ وہ دن کے دس گیارہ بجے سے شام کو چار بجے اور کبھی کبھی اس کے بعد تک کھیل کے کسی نہ کسی میدان میں رہتے، وہاں سے دفتر آ کر شہر میں کھیل کی سرگرمیوں کی خبریں تیار کرتے، اس کے بعد ٹیلی پرنٹر سے آئی ہوئی خبریں ایڈٹ کرتے اور رات میں بارہ ایک بجے کھیل کا صفحہ تیار کرنے کے بعد گھر جاتے۔

کھیلوں کے سلسلے میں اُن کے انہماک اور صلاحیتوں کی ایم۔ سی بہت قدر کرتے تھے۔ آزادی کے چند ہی برس بعد دہلی میں ہاکی یا کرکٹ کا کوئی میچ ہوا جس کی رپورٹنگ کے لیے

ایم۔سی نے محسن کو دہلی بھیجنے کا فیصلہ کیا اور کسی صاحب کے نام جن کا اسپورٹس سے سرگرم تعلق تھا ایک تعارفی خط لکھ کر اُنہیں دے دیا۔ خط کی ابتدائی سطریں اس طرح تھیں۔

Dear Mr..........

Here is Mohsin, our sports reporter. He knows everything regarding sports and whatever he does not know is not worth knowing.

محسن نے اُن صاحب کی مدد حاصل کیے بغیر کسی طرح کام چلا لیا اور یہ خط ساری زندگی اپنے پاس محفوظ رکھا۔

ایم۔سی یوں تو اداریہ اپنے کمرے ہی میں لکھتے، نیوز پرنٹ کے ایک چوڑے سے پیڈ پر، لیکن کبھی کبھی یہ بھی ہوتا کہ سب ایڈیٹروں کے کمرے میں آجاتے، کبھی کسی سب ایڈیٹر کی ایڈٹ کی ہوئی کاپی اُٹھا کر دیکھنے لگتے، کبھی کسی خبر کی سرخی بدل دیتے اور یہ بھی ہوتا کہ دو ڈھائی بجے کے بعد گلاب رائے کو دیکھ کر سمجھ جاتے کہ اب اداریہ پریس بھیجنے کا وقت ہو گیا ہے اور پیڈ اپنی طرف کھینچ کر نیلی پینسل سے نیوز پرنٹ کے پیڈ پر اداریہ لکھنا شروع کر دیتے، پیڈ کی چوڑائی میں، بڑے بڑے حروف میں۔ صفحہ مکمل ہونے پر وہ کاغذ نیچے پھینکتے جاتے۔ اُن صفحات پر نمبر ڈالنا اور اُنہیں پن کر کے کمپوزنگ کے لیے بھیجنا بھی گلاب رائے کے کاموں میں شامل تھا۔ پروف وہ خود بھی دیکھتے، کمپوزنگ کی غلطیاں درست کرتے لیکن اپنے کسی جملے میں تبدیلی کرتے ہوئے میں نے اُنہیں کبھی نہیں دیکھا۔

ایک دن اتفاق سے وہ چیف سب ایڈیٹر کے پاس کی ایک ایسی کرسی پر بیٹھ گئے جس کے سامنے کی نیم بیضوی میز پر رائٹر اور ایسوشی ایٹیڈ پریس کی بھیجی ہوئی تصویریں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ایک کے بعد ایک تصویر اور ان کی Picture-lines جو پشت پر درج ہوتی ہیں، دیکھتے

رہے۔ ایک تصویر ایسی تھی جس میں سامنے ایک پوری طرح برہنہ لڑکی کی پشت تھی اور پیش منظر میں سمندر لہریں مار رہا تھا۔ ایم۔ سی نے پکچر لائن پڑھنے کے لیے تصویر پلٹی تو کرپلانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "M.C., the picture has only one side"۔ تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھے رہنے کے بعد ایم۔ سی اپنے کمرے میں چلے گئے اور یہ یقین کرنے کے بعد ہی کہ اب وہ اپنی کرسی پر بیٹھ چکے ہوں گے، ہم لوگوں کے چہروں پر ہنسی آئی، وہ بھی ہلکی سی۔ لیکن میرا خیال تھا کہ ہم لوگوں کی نظروں سے دُور ہو جانے کے بعد ایم۔ سی بھی تھوڑی دیر تک ضرور مسکراتے رہے ہوں گے۔ برخلاف اس کے کرپلانی خاموش تھے اور کسی قدر سنجیدہ بھی، شاید یہ سوچ کر کہ ایم۔ سی نے اُن سے اس طرح کے جملے کی کبھی توقع نہ کی ہوگی۔

لیکن ہماری اور ایم۔ سی کی ممکنہ مسکراہٹوں کے اسباب مختلف ضرور تھے، اگرچہ اس وقت تک نہ ہمیں اور نہ کرپلانی کو اور نہ شاید ان کے بیشتر قریب ترین دوستوں کو معلوم رہا ہو کہ وہ Woman-hater تھے۔ (راوی عشرت علی صدیقی)

ایم۔ سی کی یادداشت غضب کی تھی۔ برسوں پہلے کے واقعات کی تفصیلات اور تاریخیں تک انہیں یاد رہتیں، اداریہ میں اقتباسات کی ضرورت پڑتی تو یادداشت ہی سے کام چلاتے، کبھی شبہ ہوتا تو سامنے لکیر کھینچ کر لکھ دیتے Please check۔ یہ ہدایت گلاب رائے سریواستو کے لیے ہوتی۔ نیشنل ہیرالڈ سے خاصے طویل تعلق کے دوران ایسے تین مواقع ضرور آئے جب موازنہ گلاب رائے سریواستو اور میں نے مل کر کیا اور سات آٹھ سطروں کے پیراگراف میں کاما تک کا فرق نہ ملا۔ البتہ مشرقِ وسطٰی کے ناموں اور واقعات کے سلسلے میں ایم۔ سی کبھی کبھی عشرت صاحب سے مدد لیتے اور حیرت کا اظہار کرتے کہ دھوں پہلے کے واقعات سے متعلق تراشوں کا رکارڈ وہ کیسے رکھ لیتے ہیں۔

چلپت راؤ کی یادداشت کے سلسلے میں ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ آزادیٔ ہند سے چھے

سات سال قبل پنڈت نہرو کو یکا یک ملک کے باہر جانا پڑا۔ایک دن قبل ہی اُنھوں نے ایک بیان جاری کیا تھا جس میں معلوم نہیں کس حوالہ سے اُنہوں نے curiouser and curiouser ترکیب استعمال کی تھی۔ یادش بخیر اس زمانہ کی سیاست میں ''دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچیے'' کا عمل دخل نہ تھا اور شرافت، علم اور ادب، ہر سیاسی قدم اور اس کے اظہار کے دائیں بائیں پہرے دار کے طور پر موجود رہتے تھے۔مسلم لیگ سے متعلق ان لوگوں نے جنہیں انگریزی زبان میں درک تھا، کانگریسیوں کو چڑانا شروع کیا۔آپ لوگ تو پنڈت نہرو کی انگریزی کی بڑی تعریف کرتے ہیں ذرا بتایئے یہ curiouser and curiouser کیا ہوتا ہے؟'' اسے طباعت یا پروف ریڈنگ کی غلطی بھی نہیں کہا جا سکتا تھا، کیوں کہ یہ الفاظ سارے ہی اخباروں میں موجود تھے۔ایم۔سی بھی ملک کے باہر تھے، اس لیے کانگریسیوں نے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی کے اساتذہ سے رجوع کیا تو زیادہ تر کیا سب نے ہی کہا کہ curiouser کے بعد curiouser کا دوبارہ استعمال غلط ہے۔مایوس اور آزردہ خاطر کانگریسیوں نے پروفیسر سدّھانت سے، جن کی انگریزی دانی کی شہرت انگلینڈ تک تھی، رجوع کیا، تو اُنہوں نے کہا "On the face of it, the usage is wrong, but Nehru has written it"۔اب اِس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ایم۔سی کی واپسی کا انتظار کیا جائے۔ پندرہ بیس دن بعد ایم۔سی جوں ہی واپس آئے دلاور حسین کپورس پہنچے۔اُن دنوں کا سفر آج کی طرح آرام دہ نہ ہوتا تھا اور ایم۔سی اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ جس طرح آئے تھے، ویسے ہی سوٹ بوٹ پہنے، ٹائی لگائے، بستر پر دراز تھے۔ان کو اس حالت میں دیکھ کر دلاور صاحب کی ہمّت نہ ہوئی کہ اس بارے میں ان سے کچھ پوچھیں، چنانچہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔تھوڑی دیر کے بعد ایم۔سی نے پوچھا

"Well Dilawar, you want to ask amything?"

"Nothing"۔دلاور صاحب نے کہا۔

تھوری دیر کی بات چیت کے بعد ایم۔سی نے یہی سوال دہرایا۔اس بار بھی دلاور

صاحب ٹال گئے، لیکن جب یہی سوال اُنہوں نے تیسری بار کیا تو وہ خود کو روک نہ سکے اور اُنہوں نے ساری بات بتادی۔ ایم۔سی مسکرائے اور کسی توقف کے بغیر بولے۔

"Well Dilawar, tell your Muslim League idiots to read A lice's Wonderland which is a gem of English literature, Edition.... Page..."

ان دنوں کپورس کے تقریباً سامنے، سڑک کی دوسری جانب، انگریزی کتابوں کی شہر کی سب سے بڑی دوکان، یونیورسل بک ڈپو، ہوا کرتی تھی۔ حسنِ اتفاق کہ دلاور صاحب کو Alice's wonderland کا وہی ایڈیشن مل گیا اور اسی صفحہ پر جس کی نشاندہی ایم۔سی نے کی تھی curiouser and curiouser موجود تھا۔

مندرجہ بالا واقعہ تو خیر شنیدہ ہے، اب ایک ''دیدہ'' بھی سنیئے۔ غالباً ۱۹۷۶ء کے آس پاس نیشنل ہیرالڈ کے ٹیلی پرنٹر پر گلاب رائے سریواستوا کے نام ایم۔سی کا ایک پیغام آیا کہ ۱۹۴۱ء میں پنڈت نہرو نے بارہ بنکی کے فلاں فلاں مواضعات کا دورہ کیا تھا، اُس کی رپورٹ اُنہوں نے خود لکھی تھی اور یہ رپورٹ ہیرالڈ کے چھٹے صفحہ پر فلاں تاریخ کو شائع ہوئی تھی، اُسے ٹائپ کر کے بھیج دو۔ ہیرالڈ کے پرانے فائل گلاب رائے نے میرے سامنے اسٹور روم سے نکالے اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایم۔سی کی یادداشت نے صرف ایک دن کا دھوکا کھایا تھا۔

ایک واقعہ کا گواہ میں بھی ہوں، اگرچہ یادداشت سے اُس کا اتنا تعلق نہیں ہے لیکن اسے اُن کی معلومات کی وسعت کا اشاریہ ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔

ایک دن سب ایڈیٹرس کے کمرے سے نکل کر میں برآمدے میں داخل ہوا ہی تھا کہ ایم۔سی کے کمرے سے ''اَبید، اَبید'' کی آواز آئی (وہ مجھے ''ابید'' ہی کہتے تھے)۔ چق اُٹھا کر اُن کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا وہ گیلی پروف لیے بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولے

"Abid, I think ulama is itself plural"

شاید کسی رپورٹر نے Ulamas لکھ دیا تھا۔

ایم۔سی لیے دیے رہتے تھے۔ان کے مونہہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکلتے تھے۔ سننے والوں کو آزمائش سے بچانے کے لیے اشاروں سے زیادہ اور الفاظ سے کم کام لیتے تھے۔ لیکن مقرر بے حد عمدہ تھے اور ان کی تقریر سن کر اندازہ کرنا بھی مشکل تھا کہ اُنہیں چھوٹے چھوٹے جملے ادا کرنے میں دقت ہوتی ہے۔ میں نے پریس کلب کے ایک مذاکرے میں ''اخبار کی آزادی'' کے موضوع پر ان کی تقریر سنی تھی۔ عشرت علی صدیقی اور نوجیون کے اس وقت کے ایڈیٹر شرما جی نے بالترتیب ہندوستانی اور ہندی میں تقریریں کی تھیں۔ ان دونوں تقریروں کی زبان کے بارے میں ایم۔سی کا ایک جملہ اب تک یاد ہے اُنہوں نے کہا تھا۔

" I could understand Ishrat's Urdu much more easily than Sharmaji's Hindi....." اُن کی پریس کلب کی تقریر تو بمشکل دس پندرہ منٹ کی تھی لیکن اُنہوں نے اقوام متحدہ کی ایک ذیلی کمیٹی میں ہندوستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے خاصی طویل تقریر کی تو اُس کی خوب خوب پذیرائی ہوئی اور تقریباً ایک ایک مندوب نے اُنہیں مبارکباد دی اور لندن ٹائمس تک نے اُس کی تعریف کی لیکن نیشنل ہیرالڈ میں یہ تقریر بے حد اختصار کے ساتھ جگہ پا سکی۔ رائٹر نے تقریر کرتے ہوئے اُن کی تصویر بھی بھیجی تھی جو کئی اخباروں میں شائع ہوئی لیکن ہیرالڈ میں اُس کی اشاعت ممکن ہی نہ تھی کیوں کہ نیویارک جانے سے قبل وہ اس سلسلے میں واضح ہدایات جاری کر چکے تھے۔

ایم۔سی کی حسِ مزاح بھی غضب کی تھی لیکن اس کا اظہار ذرا کم ہی ہوتا تھا یا ہم کو اس طرح کے واقعات کی اطلاع نہیں ہو پاتی تھی، پھر بھی وہ تین واقعات، جن کے راوی لکشمی کانت تواری اور پروفیسر ایس۔کے۔نرائن تھے،ان کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہیں۔

اسپورٹس اسٹیڈیم کے سربراہ ہابل کے مخالفین کا حلقہ خاصا بڑا تھا جو اُن پر طرح طرح کے الزامات لگاتا تھا۔ نیشنل ہیرالڈ کے اسپورٹس رپورٹر محسن ان الزامات کو صحیح سمجھتے تھے اور خبروں میں اس کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ ہابل کے حمایتیوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی اور ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کی سرگرمیاں پولیس کی نظروں میں بھی مشکوک تھیں۔ ایم۔ سی حسبِ دستور دس ساڑھے دس بجے رات میں رکشہ پر بھوپال ہاؤس میں اپنی قیام گاہ جاتے تھے۔ کھیل کے میدان کے اختلافات اور اخبار میں اس کی گونج کے پس منظر میں لکشمی کانت تواری نے ایک دن ان سے کہا "رات میں آپ مجھے یا کسی اور کو اپنے ساتھ لے لیا کیجیے۔ ہابل کے کئی حامی۔۔۔۔" ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ایم۔ سی نے نہایت سنجیدہ لہجہ میں کہا۔

"Tewari, go and tell Habul that I am the only intellectual in a family of goondas".

ان دنوں شہر کی ایک مشہور شخصیت نے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ ازدواجی زندگی کی لاج رکھنا ان کے بس کی بات نہیں، دوسری شادی کر لی۔ لکشمی کانت نے یہ خبر ایم۔ سی کو سنائی تو انہوں نے برجستہ کہا۔ **"What could he do with the first?"**

پروفیسر ایس۔ کے۔ نرائن اتوار کے دن یا جب بھی یونیورسٹی میں چھٹی ہوتی بارہ ایک بجے دن میں اپنی ایمبیسیڈر کار سے ہیرالڈ آ جاتے اور دونوں چائے پینے حضرت گنج چلے جاتے، جہاں اُردو اور ہندی کے افسانہ نگار بیر راجہ نے "بنٹوس" نام کا ہوٹل کھول رکھا تھا۔ (اُن کے بیٹے کا پیار کا نام "بنٹو" تھا)۔ اُن دونوں کو یہ ہوٹل بہت پسند تھا، شاید اس لیے کہ وہاں کی چائے عمدہ ہوتی تھی۔

اس ہوٹل میں شاکاہاری کھانے کا بھی انتظام تھا اور ریاستی اسمبلی کے اجلاس کے دنوں میں ممبران اسمبلی سے زیادہ ان کے حلقۂ انتخاب کے جو لوگ اپنے کاموں کے سلسلے میں لکھنؤ آتے تھے ان میں سے بیشتر کھانا یہیں کھاتے تھے۔ ایک دن ایس۔ کے۔ نرائن اور ایم۔ سی

چائے پینے وہاں گئے تو ان کی نظر پاس کی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے ایک شخص پر پڑی جو نہایت بدتہذیبی سے کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ اتفاق سے دوسرے دن بھی ان دونوں کا ''بنٹوس'' جانا ہوا اور اسے بھی اتفاق ہی کہیے کہ وہی شخص اسی میز پر اپنے مخصوص انداز میں کھانا کھا رہا تھا۔ جوں ہی ایم۔ سی کی نظر اُس پر پڑی وہ اپنی کرسی سے اُٹھے اور اُس کے پاس جا کر بولے

"Still eating!"

وہ غریب تو بھلا کیا سمجھا ہوگا لیکن ایس۔ کے۔ نرائن اپنے ''خندۂ دنداں نما'' پر قابو نہ پا سکے، اور جاننے والے جانتے ہیں کہ پروفیسر نرائن کا اس طرح سے ہنسنا کسی قہقہے سے کم نہیں تصور کیا جاتا تھا۔

پنڈت نہرو کے انتقال کی خبر ایم۔ سی نے کچھ اس طرح سُنی جیسے کوئی خاص بات نہ ہوئی ہو۔ اُنہوں نے اپنی شخصیت پر ایک غلاف منڈھ رکھا تھا اور دیکھنے والے کے لیے اندازہ کرنا قطعاً ممکن نہ تھا کہ اندر کیسا ہنگامہ بپا ہے۔ اندرون کے اس ہنگامے کا ہلکا سا عکس بس اُن اِداریوں سے ظاہر ہوتا جن میں ان کی صاف شفاف زبان کہیں کہیں جیسے گہری دھند میں لپٹی ہوئی معلوم ہوتی اور چند ہی سطروں کے بعد وہ کھلی وادیوں میں آ جاتے جن پر مہربان سورج چمک رہا ہوتا۔ ایسا لگتا کہ وہ خود کو یقین دلا رہے ہوں کہ پنڈت نہرو نے جس منزل کی نشاندہی کردی ہے مستقبل کا ہندوستان اسی جانب بڑھتا رہے گا، لیکن دھند ھلکے پھر گھر آتے۔ وہ حسبِ دستور دفتر آتے رہے، اداریے لکھتے رہے، گیلی پروف میں غلطیوں کی نشاندہی کرتے رہے، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ایک مہینہ گزر گیا، پندرہ دن اور گزر گئے، پھر دو مہینے بھی ہو گئے۔ ایک دن سنا کہ ایم۔ سی ایک مہینے کی چھٹی پر جا رہے ہیں اور گلاب رائے سریواستو کو بھی نہیں معلوم کہ اس دوران وہ کہاں رہیں گے اور ان سے رابطہ قائم کرنے کی کیا صورت ہوگی۔

یہ ایک نئی بات تھی۔ اُن کی اِس قدر طویل غیر حاضری، اور وہ بھی ایسی کہ اُن سے رابطہ بھی قائم نہ کیا جا سکے، کا ہیرالڈ عادی نہ تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ گوڑ صاحب یا پال صاحب نے اس بارے میں ان سے بات کی تھی یا نہیں، لیکن گمان یہی ہے کہ انہوں نے یہ زحمت نہ کی ہوگی کیوں کہ نظریاتی طور پر دونوں اُن سے میلوں دُور تھے۔ ایک دن ہمّت کر کے میں نے پوچھ ہی لیا۔

"Sir, I have heard that you..."

اُنہوں نے خاموش نظروں سے مجھے دیکھا اور بولے۔

"I want to weep"

ایم۔سی کی آنکھیں نم معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے نظریں جھکا لیں، اُنہوں نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ ٹوٹ گئے ہوں۔

صحافتی دُنیا، اقدار کے سانچے اور اخباروں سے ان کے پڑھنے والوں کے مطالبات تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ اصول پسِ پشت جا پڑے تھے، نظریات کی بے قدری بڑھتی جا رہی تھی اور Practical اور جان ڈیوی کا Pragmatic ہم معنی ہو گئے تھے۔ ہم ماضی، حال اور مستقبل میں بیک وقت جینے کے بجائے ''اب'' اور ''دائمی اب'' میں جینے لگے تھے۔ اسی دوران دہلی سے نیشنل ہیرالڈ کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تو آٹھ دس صفحات کا یہ روزنامہ مقابلتاً بہتر کاغذ پر شائع ہونے والے بارہ چودہ صفحات کے بہت پہلے سے موجود اخباروں کا مقابلہ نہ کر سکا۔

لکھنؤ کے ہیرالڈ کی آدھی کاپیاں تو ایم۔سی کے اداریوں کے لیے ہی فروخت ہوتی تھیں لیکن دہلی میں حصولِ مقصد کے طریقوں کے بجائے حصولِ مقصد، سنجیدگی کے بجائے چمک دمک، کوشش کے بجائے کامیابی اور عمل کو نظریے کے پیمانے سے ناپنے کے بجائے نظریے کو عمل کا باج گذار بنانے کی حکمرانی تھی۔ ایم۔سی دہلی میں اخبار کی جنگ ہار گئے۔ کچھ اور ٹوٹ گئے۔

دہلی میں ہیرالڈ کی رسمِ اجرا ادا کرتے ہوئے اندرا گاندھی نے کہا تھا۔ ہم نے آج دہلی میں ایک نئی window کھولی ہے، جلد ہی ہم دوسری windows بھی کھولیں گے۔ معلوم نہیں ان کا مقصد کیا تھا لیکن یشپال کپور نے جو انتظامی امور تک ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کے سب کچھ تھے اس کے معنی یہ لیے کہ وہ چاہتی ہیں کہ اخبار ملک کے مختلف مرکزوں سے شائع کیا جائے۔ چنانچہ ممبئی، گوہاٹی، بھوپال اور شاید دو چار دوسرے شہروں میں زمینیں خرید لی گئیں، اخبار نکالنے کے لیے۔ لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ اندرا گاندھی کا رویّہ تبدیل ہو گیا اور ایسوشی ایٹیڈ جرنلس پر مالی بحران کے بادل منڈلانے لگے۔ بجلیاں اگرچہ ابھی آشیاں سے دُور ہی چمک رہی تھیں لیکن اب وہ وسائل مفقود ہو چکے تھے جو اخبار کو بہتر بنانے اور اُسے دوسرے اخباروں کے مقابل پیش کرنے کے لیے ضروری تھے۔ مرکزی حکومت سے کانگریس کی بے دخلی اور ایک ایسی حکومت کے قیام نے جس کا قطب نما ایک مختلف سمت کی نشاندہی کرتا تھا، رہی سہی کمی بھی پوری کر دی۔

پنڈت نہرو نے کہا تھا کہ لوگ کہتے ہیں نیشنل ہیرالڈ میرا اخبار ہے لیکن یہ اصل میں چلپت راؤ کا ہے۔ لیکن نہ اب نہرو تھے، نہ ان کی آواز کی گونج۔ اخبار کی انتظامیہ نے جو اُن کے نظریات کی نمائندگی کا دم بھرتی تھی، ایم۔ سی کو چیف ایڈیٹر بنا کر ایک ایسے شخص کو ایڈیٹر بنا دیا جو نظریاتی طور پر تو کھرا تھا مگر جسے کسی روزنامہ کا تجربہ نہ تھا۔ وہ بھلا نیشنل ہیرالڈ کے ان ہزاروں قارئین کی توقعات پر کیسے پورا اُترتا جو زبان و بیان کی نزاکتوں، خیالات کے واضح لیکن خوبصورت اظہار اور Magnus کے فرضی نام سے ایم۔ سی کے ہفت روزہ مزاحیہ کالم کے عادی ہو چکے تھے۔ ایک بات اور بھی تھی۔ پنڈت نہرو ایم۔ سی کے ناز نخرے برداشت کرنے کے علاوہ ان کی دلداریاں بھی کرتے تھے، وہ مستعفی ہوتے تو ان کا استعفیٰ ٹھنڈے بستے میں ڈال دیتے اور بھول جاتے۔ وہ نہ صرف زرگر بلکہ جوہر شناس بھی تھے۔

اور ایک دن ہندوستان کی صحافت میں ایک زبردست انقلاب آیا، ایک بہت بڑا

دھا کہ ہوا۔ ایم۔ سی رٹائر کر دیے گئے۔

نیشنل ہیرالڈ کو سنبھالا دینے کی کوشش کس نے نہیں کی خشونت سنگھ، تھیرین، ہری جے سنگھ، چترنجن، پی۔ سی۔ ٹنڈن۔ اِن کے علاوہ بھی چند نام ہیں لیکن اس عظیم الشان عمارت کے مینار و محراب ایک ایک کر کے گرتے رہے پھر بھی زندگی کی تہمت ہیرالڈ پر برسوں لگی رہی۔ لیکن پنڈت نہرو نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ نیشنل ہیرالڈ ایم۔ سی کا اخبار ہے، ان کی سبکدوشی کے بعد نام تو وہی رہا لیکن اخبار ہو کچھ اور گیا۔

ہیرالڈ کی یہ بے قدری ایم۔ سی نے برسوں دیکھی۔ آنسوؤں کے بغیر تو زندگی کے آخری دم تک روئے ہوں گے لیکن یہ بھی ہوا ہو گا کہ ضبط کا دامن چھوٹ جانے پر آنسو بہہ نکلے ہوں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایم۔ سی مغرور تھے۔ ممکن ہے اُن کا یہ خیال صحیح ہو، لیکن مغرور لوگ چپراسیوں کی بینچ پر ان کے ساتھ بیٹھ کر چائے نہیں پیتے، اپنی تنخواہ میں اضافہ کی رقم کو دفتر کے درجہ چہارم کے ملازمین میں برابر برابر بانٹ دینے پر اصرار نہیں کرتے اور دفتر کے کسی کمرے، پریس کلب اور کافی ہاؤس میں داخل ہونے پر کوئی احتراماً کھڑا ہو جائے تو بُرا نہیں مانتے۔ مغرور ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں تو وہی کہہ سکتے تھے لیکن ان کے ملنے والوں میں ہر ایک کو یہ احساس ضرور تھا کہ وہ خود شناس ہیں۔

انتہائی بے نیازی اور نام و نمود سے بے پروائی انہیں پسند تھی، بادِ مخالف کا مقابلہ کرنا انہیں اچھا لگتا تھا لیکن ہوائیں یکایک رُخ بدل لیں اور بادِ صبا بادِ گرد بن جائے تو کوئی مخالف سمت میں کب تک چل سکے گا؟ آخر کبھی تو تھک ہار کر بیٹھ ہی رہے گا اور یہی ایم۔ سی نے بھی کیا۔

دہلی کی کسی سڑک کے کنارے ایک معمولی سے ڈھابے میں ۲۶ / مارچ ۱۹۸۳ء کو ایک لمبا چوڑا شخص داخل ہوا، بینچ پر بیٹھ کر اس نے چائے مانگی، ذرا سی دیر میں چائے آ گئی تو دو تین

چسکیاں لیں۔تھوڑی دیر بعد ڈھابے کا ملازم پیالی اُٹھانے آیا تو اس میں آدھی سے زیادہ چائے باقی تھی۔لیکن چائے پینے والا جا چکا تھا۔

اُس ڈھابے میں یا آس پاس ایسا کوئی نہ تھا جو اُنہیں پہچانتا ہو۔کچھ لوگوں نے مل کر یہ بھاری بھرکم جسم ایک کھری سی چارپائی پر ڈال دیا۔پولیس آ گئی،اس کے پاس بھی شناخت کا کوئی ذریعہ تھا نہ اُنہیں پہچاننے والا کوئی مخبر۔شرفا،پڑھے لکھوں اور اقدار کے پاسبانوں سے پولیس کو کیا واسطہ۔تھوڑی دیر بعد اخبار کے دفتروں کے تار کھڑکھڑائے،فوٹو گرافر آ گئے۔اُن میں بھی کوئی ایسا نہ تھا جو اُن کو پہچانتا ہو۔آخر ایک سینئر رپورٹر نے اُنہیں پہچان لیا۔

یہ ایم چلپت راؤ تھے۔

ایک پتہ نہ کھڑکا،ایک نوجوان صحافی کی آنکھ نہ نم ہوئی۔

اگلے دن کے تقریباً سارے ہی اخباروں میں اُن کے انتقال کی خبر صفحہ اوّل پر شائع ہوئی۔تصویر ایک آدھ جگہ ہی چھپ سکی کہ اُن کی تصویر ملتی کہاں سے۔

تعزیتی جلسے ہوئے،جن میں اُن کی خدمات کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا گیا،بہت سے چھوٹے بڑے مضامین لکھے گئے۔لیکن پھر سب کچھ پہلے کی طرح کبھی نہ ہوا۔نہ صرف صحافت بلکہ زندگی کا ایک باب،جو پوری کتاب تھا،ختم ہو گیا۔یہ باب اب شاید ہی کبھی پڑھا جائے۔

پسِ پردہ رہ کر کام کرنے والوں کا ہمیشہ سے یہی انجام ہوتا آیا ہے اور آج جب لمحۂ گزراں کو آنکھوں ہی نہیں ذہنوں سے اُوجھل ہوتے دیر نہیں لگتی اور جب ایسے گڑے مردے اُکھاڑ کر جو اپنی زندگی میں بھی زندہ نہ تھے دیواروں پر سجائے جا رہے ہیں،ایم۔سی کو بھلا کیوں یاد رکھا جائے،اس میں فائدہ ہی کیا ہے؟

■ ■

آل احمد سرور

آل احمد سرور صاحب کو پہلی بار اُن کے بیَر وروڈ (لکھنؤ) کے مکان میں دیکھا۔ گوراچٹا رنگ، میانہ قد، چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ، آنکھوں میں علم اور ذہانت کی چمک اور ہونٹوں پر پان کی ہلکی سی سرخی۔ یہ بات ۱۹۴۹ء کی ہے۔

میں کرسچین کالج میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا اور سبجیکٹ ایسا تھا، یعنی کامرس، جس میں اُردو کا گزر تک ممکن نہ تھا۔ سرور صاحب کے یہاں ''انجمن ترقی پسند مصنّفین'' کے جلسے ہوتے تھے لیکن میں ''انجمن'' کے نام تک سے واقف نہ تھا اور بس ایک ادبی جلسے میں شرکت کے لیے مجید پرویز اور برجوہن ناتھ کاچر کے اصرار پر اس اُمید میں چلا گیا تھا کہ کچھ نظمیں، غزلیں، خاص طور سے غزلیں، سُننے کو مل جائیں گی۔ ادب سے کچھ خاص دلچسپی نہ تھی لیکن یہ ضرور تھا کہ جو کچھ ہاتھ لگتا پڑھ ڈالتا تھا۔ اُس وقت تک کسی ادبی جلسے میں شرکت نہ کی تھی اور جدید وقدیم، ترقی پسندی، ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی قسم کی اصطلاحات یا نیم اصطلاحات سے شناسائی بھی نہ تھی۔

اُن دِنوں پر آج نظر ڈالتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ ادب کے سارے ابتدائی سبق

سرور صاحب کے، بیَر ورووڈ کے مکان پر تقریباً مستقلاً اور علیم صاحب کے یونیورسٹی کے ڈیلی گیسی سینٹر پر کبھی کبھی ہونے والے انجمن ترقی پسند مصنّفین کے جلسوں میں ہی پڑھے تھے۔

ان ادبی نشستوں میں جو کچھ سیکھا وہ زیادہ تر ترقی پسندی سے عبارت تھا۔ لیکن اس میں دوسرے بزرگ شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کا حصّہ سرور صاحب سے زیادہ تھا کیوں کہ اُن کی ترقی پسندی اس قدر لطیف تھی اور حریری پردوں میں لپٹی ہوئی کہ مجھ ایسے نوسکھیے کے لیے اُسے سمجھنا بھی مشکل تھا۔

اتفاق بلکہ حسنِ اتفاق سے انہی دنوں طلبہ کی تحریک سے اسٹوڈینٹس فیڈریشن اور اسٹوڈینٹس فیڈریشن سے کمیونسٹ پارٹی تک رسائی ہوگئی اور سرور صاحب کی ترقی پسندی تھوڑی بہت سمجھ میں آنے لگی لیکن اُن کی باتیں ذرا پھیکی پھیکی لگتیں۔

اُن دنوں شہر کے سارے ہی نوجوان، جن کا اوڑھنا بچھونا ادب تھا، ''احتشامیوں'' اور ''سروریوں'' میں بٹے ہوئے تھے اگرچہ اُن دونوں کے آپس کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے، یعنی مدعی سست گواہ چست والی صورت تھی۔ یہ تقسیم اپنی جگہ لیکن وہ جو ''احتشامیے'' نہ تھے تعداد میں کم تھے، بہت ہی کم۔ سبب شاید اس کا یہ تھا کہ شخصیت کی موہنی کے باوجود سرور صاحب کی تنک مزاجی اور زود رنجی نے ہمیں احتشام صاحب کے مزاج کی ہلکی سی یاسیت اور گرم جوشی کے فقدان کا رسیا بنادیا تھا۔ ایک معاملہ اور بھی تھا۔ سرور صاحب میانہ روی کے قائل تھے اور وہ زمانہ آر پار کا تھا۔

انجمن کے جلسوں میں تخلیقات پڑھی جاتیں، اُن پر کھل کر بحثیں ہوتیں، کبھی کبھی مار کاٹ کی نوبت بھی آجاتی۔ سرور صاحب تخلیق کی خوبیوں کی نشاندہی کرتے اور پھر چند خامیوں کی اور یہ بھی جوڑ دیتے کہ یہ خامیاں نہ ہوتیں تو تخلیق اور خوبصورت ہوتی۔ کبھی کبھی اِس کی معکوس شکل بھی پیش آتی۔ اس وقت یہ سوچا بھی نہ تھا کہ لگ بھگ پچاس سال بعد، جدیدیت سے ہوتے ہوئے، ہم تنقید کی اس منزل پر پہنچ جائیں گے جہاں ''صورتِ حال'' قدر کی نعم البدل بن جائے گی۔

انجمن کے اس جلسہ میں تو میں موجود نہ تھا جس میں حیات اللہ انصاری صاحب نے ترقی پسندوں اور کمیونسٹوں کو جی بھر کے برا بھلا کہا تھا اور خاصی بدمزگی پیدا ہوگئی تھی، لیکن میں نے اگلے جلسے میں وہ رپورٹ ضرور سنی تھی جو حبیب الرحمٰن صاحب نے پیش کی تھی۔ وہ اُن دنوں انجمن کی مقامی شاخ کے سکریٹری تھے۔ جہاں تک یاد ہے اس رپورٹ میں حیات اللہ صاحب کے فرمودات پر سرور صاحب کے کسی ردِّ عمل کا ذکر نہ تھا۔

''احتشامیے'' اور ''سروریے'' کی گروہ بندی کچھ وضاحت چاہتی ہے کہ اس کی ذمہ داری ان دونوں میں سے کسی کی بھی نہ تھی۔ ہوا بس یہ تھا کہ شعبۂ اُردو میں ریڈر کی جگہ کے اُمیدوار یہ دونوں ہی تھے۔ سلیکشن میں ماہر کی حیثیت سے مولوی عبدالحق بلائے گئے تھے جنہوں نے احتشام صاحب سے Form اور Matter کے اُردو متبادل دریافت کیے تھے۔ فارم کے لیے ''ہیئت'' تو مولوی صاحب کے لیے قابلِ قبول تھا لیکن Matter کے لیے ''مواد'' اُنہیں نہایت کریہہ اور مکروہ معلوم ہوتا تھا اور مواد کی اسی ''کراہیت'' نے فیصلہ سرور صاحب کے حق میں کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں سرور صاحب کا کوئی قصور نہ تھا لیکن ہم ریڈر شپ سے احتشام صاحب کو محروم کیے جانے کے لیے اُنہیں ہی ذمہ دار سمجھتے تھے۔

میں نے بی۔ اے میں داخلہ لیا تو مضامین میں انگریزی اور فلسفے کے علاوہ اُردو بھی تھی لیکن احتشام صاحب کی شخصیت کا جادو اور اس سے زیادہ جارحانہ ''احتشامیت'' کچھ اس طرح دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھی کہ پہلے ہی دن سرور صاحب رجسٹر ہاتھ میں لیے کلاس روم میں داخل ہوئے تو میں نے رجسٹرار آفس جا کر اُردو کے بجائے اکنامکس لے لی اور بعد میں اپنے اس غلط فیصلے کی قیمت دو برسوں کی شکل میں چکائی (ویسے اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا۔) یہ سب اپنی جگہ، لیکن سرور صاحب کی عزت اور احترام میں کمی کبھی نہ آئی اور اُن کی شخصیت کی محبوبیت کے سحر سے آزاد ہونا کبھی ممکن نہ ہو سکا۔

چھوٹا سا شعبۂ اُردو غالباً تین اساتذہ اور بی۔ اے سے لے کر ایم۔ اے آنرس تک کے

بمشکل چالیس پینتالیس طلبہ پر مشتمل تھا۔ اُردو کی کم بودگی کو چند برس ہو چکے تھے اور یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس شعبہ یا اس سے متعلق کسی شخص کا کوئی مسئلہ ایسا بھی ہو سکتا ہے جس سے ان چالیس پچاس لوگوں کے علاوہ کسی اور کو دلچسپی ہوگی۔ لیکن وہ دن بھی دیکھا جب یونیورسٹی کے سارے ہی طلبہ ''سروریوں'' میں شامل ہو گئے۔ ہوا یہ تھا کہ وزیر اعلیٰ سی۔ بی گپتا نے جو سرور صاحب کے یہاں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے جلسوں کے سبب ان سے ناراض تھے مسعود حسن رضوی صاحب ادیبؔ کی سبکدوشی کے بعد موسوی صاحب کو صدر شعبہ بنا دیا تھا اور سرور صاحب اس ناانصافی کے خلاف احتجاج کے طور پر مستعفی ہو گئے تھے۔ استعفے کی خبر یونیورسٹی میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور اسٹوڈنٹس یونین کی اپیل پر طلبہ نے ہڑتال کر دی جو دوسرے دن بھی جاری رہی۔ لیکن سرور صاحب علی گڑھ جانے کا فیصلہ کر چکے تھے اور استعفے پر بضد تھے ورنہ وائس چانسلر (غالباً) اچاریہ جگل کشور نے گپتا جی پر اپنے اثرات استعمال کر کے مسئلہ کا کوئی حل نکالنے کی کوشش کرنے کے لیے آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ یہ تھا یونیورسٹی میں سرور صاحب کی مقبولیت کا حال۔

ان دنوں انجمن کے جلسوں میں نو واردانِ بساطِ ہوائے دل بلکہ ہوائے ادب اور مقابلۃً سینیئر ادیب و شاعر بھی صرف چھے آنکھیں دیکھا کرتے تھے اور یہ چھے آنکھیں تھیں ڈاکٹر علیم، احتشام حسین اور آل احمد سرور کی۔ علیم صاحب کی سوچتی ہوئی آنکھیں اور اسی مناسبت سے چہرے پر بس ہلکی سی مسکراہٹ اور وہ بھی کبھی کبھی، احتشام صاحب کی یاسیت بلکہ فلسفیانہ غم میں ڈوبی ہوئی آنکھیں جو ہنسی کی راہ میں رکاوٹ کبھی نہ بنتیں اور سرور صاحب کی مسکراتی ہوئی آنکھیں، ایسی کہ قہقہوں کے درمیان بھی اجنبی نہ معلوم ہوتیں۔

بَیر وروڈ کا سرور صاحب کا مکان کرایے کا تھا اور مالک مکان اس پر قبضہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ نوبت مقدمہ بازی تک پہنچ گئی تھی۔ سرور صاحب اس کوچے میں اجنبی تھے چنانچہ انجام وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا، یعنی وہ مقدمہ ہار گئے۔ خوش قسمتی سے امین آباد کی نعمت اللہ بلڈنگ کا ایک بڑا حصہ اُنہیں کرایے پر مل گیا اور وہ وہاں منتقل ہو گئے لیکن جس وقت مکان سے

اُن کا سامان نکالا جارہا تھا اور مالک مکان کے تندرست وتوانا نمائندے اپنی عقابی آنکھیں گڑائے وہاں بیٹھے تھے ہم میں سے بہت سوں کو محسوس ہورہا تھا گویا ہمیں اپنے اپنے مکانوں سے بے دخل کیا جارہا ہو۔

نعمت اللہ بلڈنگ میں سرور صاحب کی نئی قیام گاہ پر ایک بڑا جلسہ ہوا۔ بڑا یوں کہ ڈاکٹر فریدی سوویت یونین کے دورے سے چندروز قبل لوٹے تھے اور ڈاکٹر محمد حسن نے اُنہیں انجمن کے جلسے میں اپنے تجربات اور تاثرات بیان کرنے پر آمادہ کرلیا تھا۔ فریدی صاحب کمیونسٹ تو دور کی بات، Fellow-traveller بھی نہ تھے بلکہ بہت دنوں بعد ایک بار تو میں نے اُنہیں میجر حبیب اللہ سے، جو کمیونسٹوں کے بارے میں خاصے خوش گمان تھے، اختلاف کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اس جلسے میں ادیبوں کے علاوہ اسٹوڈینٹس فیڈریشن، ISCUS (انڈوسویٹ کلچرل سوسائٹی) اور IPTA (انڈین پی پلس تھیٹر ایسوسی ایشن) سے متعلق ایسے سارے ہی افراد موجود تھے جنہیں ادب سے تھوڑی بہت بھی دلچسپی تھی۔ ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے، اور ان کی تعداد خاصی تھی، جو کمیونسٹوں اور سوویت یونین کے بارے میں نہ صرف خوش گمان نہ تھے بلکہ ایمان کی حرارت قائم رکھنے کے لیے ان کے زوال کے متمنی رہتے تھے اور اس اُمید میں آئے تھے کہ فریدی صاحب سوویت یونین اور اس کے نظامِ حکومت کی بخیہ اُدھیڑ کے رکھ دیں گے۔

فریدی صاحب نے اپنی تقریر اس وضاحت کے ساتھ شروع کی کہ وہ سوشلزم، کمیونزم اور سوویت یونین کے نظامِ حکومت کے بارے میں کسی خوش گمانی میں مبتلا نہیں اور اپنے تاثرات پیش کرتے وقت کوشش کریں گے کہ معروضیت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ اس کے بعد انہوں نے سوویت یونین کی جی کھول کر تعریف کی، نئی کتابوں کے ایڈیشنوں کے ایک دن میں فروخت ہوجانے کا ذکر کیا، یہ بتایا کہ وہاں ایک بھی شخص بے روزگار نہیں ہے، بہترین طبّی سہولیات سے ہر شخص مستفیض ہوتا ہے کیوں کہ علاج معالجہ بالکل مفت ہے اور بچوں کا اس قدر

خیال رکھا جاتا ہے کہ اگر اتفاق سے کوئی بچّہ بیچ سڑک پر آ جائے تو سارا ٹریفک رُک جاتا ہے چاہے اس میں صدرِ مملکت کی گاڑی ہی کیوں نہ ہو۔ اُنہوں نے یہ بھی بتایا کہ اپنے پندرہ روزہ قیام کے دوران ایک بڈھے کے علاوہ اُنہیں کوئی فقیر نظر نہیں آیا اور اس کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ رٹائرڈ فوجی ہے، شراب کی لت پڑ گئی ہے اور اپنے شوق کی تکمیل کے لیے کبھی کبھی پیسے مانگتا ہے اور لوگ دوسری جنگِ عظیم میں اس کی خدمات سے واقف ہونے کے سبب اُسے مایوس نہیں کرتے۔

غرض فریدی صاحب نے سوویت یونین کی خوب خوب تعریفیں کیں، جو شرکائے جلسہ کے ایک حلقے نے کڑوے گھونٹ کی طرح پی لیں۔ لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ جب فریدی صاحب نے بتایا کہ سوویت یونین میں متعدد مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں جن کی اپنی اپنی ریاستیں تک ہیں لیکن اُن کے درمیان تصادم تو دور کی بات کسی بڑے اختلاف کی بھی نوبت نہیں آتی تو یہ بات ایک نوجوان کو اپنے عقائد سے اس قدر متصادم معلوم ہوئی کہ اُس نے بہ آوازِ بلند پوچھا۔

"کیا روس میں ہندو مسلم فسادات بھی نہیں ہوتے؟"

فضا میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔ یہ ساری رام کہانی سنائی صرف یہ بتانے کے لیے ہے کہ اس اجتماعی قہقہہ میں شاید سب سے بلند آواز سرور صاحب ہی کی تھی۔

بعد میں سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ سرور صاحب نے بھی چند باتوں کی وضاحت چاہی اور اُن کے سوالات سے سوویت یونین کی جانب کسی قسم کی ہمدردی مترشح نہیں ہوتی تھی۔

سرور صاحب اگرچہ نوجوانوں سے گھل مل نہیں پاتے تھے اور ایک فاصلہ برقرار رکھتے تھے لیکن یہ فاصلہ نوجوان ادیبوں کی ہمّت افزائی میں مانع نہیں ہوتا تھا۔

میں نے انجمن کے ایک جلسے میں اپنا افسانہ "دو نقش ایک تصویر" ڈرتے ڈرتے سنایا۔ ڈرتے ڈرتے یوں کہ آل احمد سرور اور احتشام حسین کے سے عالموں کے سامنے اپنی کوئی چیز

پڑھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ خیر، افسانہ کچھ لوگوں کو پسند آیا، کچھ کو پسند نہ آیا، لیکن باقر مہدی نے اپنے کچھ اس طرح کے جملے سے کہ ''صرف موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اپنا نصف گھنٹہ ضائع کیا'' افسانے کے گلے پر چھری ہی پھیر دی۔ باقر مہدی سے لوگ اُلجھنے سے گریز کرتے تھے اگرچہ اُنہیں کوئی خاص اہمیت بھی نہیں دی جاتی تھی۔ ایک آدھ کمزور سی آواز میرے افسانے کی حمایت میں اُٹھی ضرور لیکن باقر مہدی کے کاٹ دار جملے کا بہر حال جواب نہیں دیا گیا۔ سرور صاحب نے جو باقر مہدی کے جملے سے یقیناً بے لطف ہوئے تھے میرے افسانے کی خاصی تعریف کی، اُس سے زیادہ جس کا وہ مستحق تھا۔

یہ تھا اُن کا انداز نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کا۔

تقریباً چار پانچ سال بعد سرور صاحب علی گڑھ کیا گئے کہ لکھنؤ میں انجمن کا شیرازہ ہی بکھر گیا۔ ویسے بھی اُس کے بکھرنے کے دن شاید آ ہی گئے تھے۔

علی گڑھ جب بھی جانا ہوتا سرور صاحب سے نیاز ضرور حاصل کرتا، عام طور سے شعبے میں اور کبھی کبھی شام میں اُن کے گھر پر جو میرے چھوٹے بھائی کے مکان کے پاس ہی تھا۔

ایک زمانے میں سرور صاحب قاضی عبدالستار سے خوش نہ تھے اور یہ ناخوشی شعبے سے اُن کا باقاعدہ تعلق قائم ہونے کے بعد بھی برقرار تھی۔ ایک بار ملاقات کے لیے شعبے میں گیا تو قاضی صاحب سے گیلری ہی میں ملاقات ہوگئی۔ میں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو قاضی صاحب مجھے اپنے کمرے میں لے جانے کے بجائے صدر شعبہ کے کمرے کی طرف بڑھے۔ اتفاق سے اُسی وقت سرور صاحب اپنے کمرے سے باہر نکلے اور مجھے دیکھتے ہی محبت اور گرمجوشی سے ہاتھ ملایا، خیریت دریافت کی۔ میرا ہاتھ چھوڑنے کے بعد اُنہوں نے قاضی صاحب کی طرف دیکھا اور کہا ''آپ سے بھی ہاتھ ملا لوں؟'' میں نے کہا ''میرے سامنے تو ملا ہی لیجیے'' اب یہ قطعاً یاد نہیں کہ اُنہوں نے قاضی صاحب سے ہاتھ ملایا تھا یا نہیں لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ کمرے میں پہنچنے کے بعد اُنہوں نے فوراً ہی چائے منگائی تھی۔ قاضی صاحب کو کلاس لینا تھا اس لیے وہ تو تھوڑی

دیر کے بعد چلے گئے تھے لیکن سرور صاحب مجھ سے کم وبیش آدھ گھنٹے تک باتیں کرتے رہے تھے۔ اس دوران اُنھوں نے لکھنؤ کے متعدد ادیبوں اور شاعروں اور یونیورسٹی کے چند اساتذہ کی بھی خیریت دریافت کی تھی اور ڈاکٹر ایس۔ کے۔ نرائن اور ڈاکٹر نریش چندر کے بارے میں خاصی دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔

سرور صاحب فنافی التصنیف و مطالعہ ضرور تھے لیکن مجلسی زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے بھی وقت نکال لیتے تھے۔ یوں تو کسی قدر لیے دیے رہتے لیکن حلقۂ احباب میں ضرور کُھلتے۔ چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ رقصاں رہتی۔ جب تک لکھنؤ میں رہے ہفتے میں ایک آدھ بار اُولڈ انڈیا کافی ہاؤس ضرور جاتے جہاں میں نے اُنہیں امرت لال ناگر، پنڈت آنند نرائن ملّا اور منظر سلیم اور دوسرے مقابلۃً کم عمر نوجوانوں سے ہنس ہنس کے باتیں کرتے بارہا دیکھا تھا۔ کبھی کبھی باہر سے آنے والے ادیبوں اور شاعروں کو لے کر آتے اور اُن کا تعارف کراتے وقت تعریف میں اکثر فیاضی سے کام لیتے۔

سرور صاحب شدید غصّے کا اظہار ذرا کم کرتے تھے لیکن اس کے بھی مواقع نکل ہی آتے تھے۔ دو واقعات مجھے یاد آرہے ہیں۔

غالباً ۱۹۷۲ء یا ۱۹۷۳ء کی بات ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے پبلک ایڈمنسٹریشن بلاک میں جامعات کے اردو اساتذہ کی کل ہند کانفرنس ہوئی تھی۔ شہر کے ادیبوں کا اس کانفرنس سے کوئی تعلق تو نہ تھا لیکن ہم لوگ تقریباً روزانہ ہی اس کے اجلاسوں میں شرکت کرتے، البتہ دوپہر کے کھانے کے وقفے میں اِدھر اُدھر ہو جاتے۔ پبلک ایڈمنسٹریشن بلاک کے سامنے ہی اس وقت کا وی۔ سی گیسٹ ہاؤس تھا۔ بیشتر مندوبین وہیں ٹھہرے تھے اور کھانا بھی وہیں ہوتا تھا۔ ایک دن کچھ دوستوں نے احمد جمال پاشا کو کھانے پر بٹھا لیا۔ اتفاق سے کھانے کی میز پر اُن کی کرسی سرور صاحب کی کرسی کے بالکل پاس تھی۔ کھانے میں شاید مرچ زیادہ تھی۔ سرور صاحب نے پہلا ہی لقمہ لیا تو ہلکی سی ''سی'' کی آواز اُن کے مونہہ سے نکلی۔ آواز سنتے ہی جمال کی رگِ

شرارت پھڑکی اور اُنہوں نے آہستہ سے کہا "سالن میں ڈپسی ہوئی بجلیاں[1] پڑی ہوئی ہیں"، سرور صاحب کا چہرہ سرخ ہوگیا اور اُنہوں نے نہایت درشت لہجے میں کہا "جمال صاحب اپنی حیثیت سے بڑھ کر بولنے کی کوشش نہ کیجیے ورنہ نہایت سختی سے پیش آؤں گا۔" جمال نے موقع کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہی اظہارِ معذرت کے طور پر سرور صاحب کا پیر پکڑنے کے لیے کرسی پیچھے کی لیکن اُنہوں نے اس کی نوبت نہ آنے دی اور بات رفت گزشت ہوگئی۔

ایک بار سرور صاحب مجھ سے بھی ناراض ہوئے۔

انہوں نے اُردو کی صورتِ حال کے بارے میں ایک مضمون شاید ساہتیہ اکادمی کے انگریزی جریدے کے لیے لکھا تھا جس میں "شب خون" کے خوب خوب ذکر کے علاوہ "شمع" اور "بیسویں صدی" کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا تھا لیکن "ماہنامہ کتاب" کا نام تک نہ تھا۔ مضمون کا ترجمہ یا اصل مضمون "ہماری زبان" میں بھی شائع ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سرِور صاحب کو "جدیدیت" کی ہمنوائی شروع کیے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے، وہ "جدیدیت" پر ہندوستان میں پہلا سیمنار علی گڑھ میں کر چکے تھے یا کرنے والے تھے اور "ہماری زبان" میں، جس کے وہ اُن دنوں سب کچھ تھے، اُردو کی حد تک اس نئے ادبی نقطۂ نظر یا رجحان کی حمایت میں مضامین برابر شائع ہو رہے تھے۔

میں نے نہایت نرم الفاظ میں اُنہیں ایک خط لکھا جس میں باتیں کسی قدر سخت کی گئی تھیں اور دبے لفظوں میں خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ آپ کے مضمون میں "کتاب" کا نام شاید اس لیے جگہ نہ پا سکا کہ اس کا جھکاؤ ترقی پسندی کی طرف ہے اور آپ اب جدیدیت کے حامی ہیں۔ اس خط میں شاید "ہماری زبان" کا بھی ذکر تھا۔

سرور صاحب کے جواب کے الفاظ تو نرم تھے لیکن اُن کے خط کا ایک ایک لفظ اُن کے غصّے کی چغلی کھا رہا تھا۔ غصّے کا عالم یہ تھا کہ سرنامہ پر تاریخ کے ساتھ علی گڑھ کے بجائے لکھنؤ لکھ

---

[1] غالب وجدان کے شاعر نہیں ذہن کے شاعر ہیں مگر اُن کا ذہن وجدان کی پسی ہوئی بجلیوں سے بنا ہوا ہے۔
آل احمد سرور۔ بحوالہ "آئینہ خانے میں"۔ صفحہ۔ ۱۱۱۔ از اُسلوب احمد انصاری۔

گئے تھے۔ مضمون میں ''کتاب'' کا ذکر نہ ہونے کو اُنہوں نے ''بھول جانے'' پر محمول کیا تھا اور مجھے حیرت تھی کہ جس رسالہ میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے اُن کے انٹرویو کے ساتھ پورے صفحے پر اُن کی تصویر شائع ہوئی ہو اور جس میں اُن کے مضامین آن بان سے شائع ہوتے ہوں اُس کا نام وہ بھول کیسے گئے۔ اپنے خط میں سرور صاحب نے فلسفہ اور ادب کے کسی موضوع پر ''اُردو ادب'' میں مضمون لکھنے کی دعوت دینے کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ انجمن کا یہ سہ ماہی معاوضہ دیتا ہے۔ میرا اصرار تھا کہ میں معاوضے کے بغیر ''ہماری زبان'' میں لکھنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو تین تین خطوط لکھے لیکن اُنہوں نے انجمن کے ہفت روزہ میں لکھنے کے لیے مجھ سے جھوٹوں بھی نہ کہا۔

چند ماہ بعد علی گڑھ جانا ہوا تو حسبِ دستور اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہمیشہ کی طرح محبت سے ملے اور اس ناخوشگوار واقعے کا ذکر تک نہ کیا، اس کے بعد بھی کبھی نہیں۔ یعنی معاف کردیا، شاید اس لیے کہ میں اِس لائق نہ تھا کہ ناراضگی تادیر قائم رکھی جائے۔ لیکن یہ صورت ہر ایک کے ساتھ نہیں تھی۔ جو اِس قابل ہوتے اُن کے ساتھ، اگر ''ملاقات'' کے بجائے ''دل برداشتگی'' پڑھا جا سکے تو ''عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے'' کا معاملہ ہوتا تھا۔

سرور صاحب کی زود رنجی کا ذکر پہلے آچکا ہے، کبھی کبھی وہ پھٹ بھی پڑتے تھے۔ بعض آزردگیاں اور خاص طور سے وہ جو اُن سے پہنچیں جن سے اُن کی توقع ہی نہ ہو ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں پالنا ہی پڑتا ہے۔ یہی صورت سرور صاحب کے ساتھ بھی تھی، ان کا ذکر ''خواب باقی ہیں'' میں جگہ جگہ ہے، کہیں برملا، کہیں اشاروں کنایوں میں، اگرچہ ان کا دائرہ اکثر و بیشتر علی گڑھ تک محدود ہے۔ لکھنؤ میں اُن کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا اس کی یاد کو تو انہوں نے دامن سے جھٹک دیا لیکن علی گڑھ کے سلسلے میں یہ ممکن نہ تھا کہ انھوں نے مسلم یونیورسٹی کو ہی اپنی پناہ گاہ، کارگاہ اور میدانِ کارزار بنالیا تھا۔ انہوں نے دوسروں کو زخمی کیا اور خود بھی زخمی ہوئے لیکن، اور یہ قابلِ ذکر ''لیکن'' ہے، عام طور سے ایسا کچھ بھی نہیں کیا جو آدابِ مبازرت اور مقابل کی شان کے

منافی ہو، نہ اُن زخموں کی نمائش کی جو اُنہیں لگے، نہ اُن پر تفاخر کا اظہار کیا جو اُنہوں نے دوسروں کو لگائے ۔۔۔۔ یہ باب اُنہوں نے جہاں بھی کھولا، گفتار میں ہو یا تحریر میں، نہ اپنی عظمت پر آنچ آنے دی نہ اپنے ہدف کی عظمت پر۔ یہ یلکیکی (Duel) کھیلتے ہوئے اُنہوں نے اکثر صورتوں میں کھیل کے قاعدوں کی پاسداری کی، البتہ ایک آدھ جگہ اُن سے چوک بھی ہوئی جب ہوا میں تیرنے کے بعد ان کا تیر جہاز کے اس حصے پر لگا جو عرشے کے نیچے ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بھی وہ اپنے نشانے کے روشن مقامات کو نہیں بھولے۔ اُنہوں نے ہجو ملیح سے بہت آگے جانے سے ہمیشہ گریز کیا، تاہم کہیں کہیں ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ بھی گیا ہے۔۔۔۔ ہوتا یہ ہے کہ جہاں عظمتیں ٹکراتی ہیں ناخوشی کی صورتیں پیدا ہو ہی جاتی ہیں۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ سرور صاحب یقیناً ایسے بڑوں میں تھے۔ اور ان کے ''ممدوحین'' بھی۔

سرور صاحب میں ایک خوبی اور تھی۔ وہ اپنی عظمت اور علمیت ظاہر نہیں کرتے تھے، اُن کا اظہار خود بخود ہو جاتا تھا۔ ان کی شخصیت میں اس بلا کی کشش تھی کہ وہ سامنے ہوں تو کوئی اُن سے آزردہ خاطر مشکل ہی سے رہ سکتا تھا۔ اُن کی ایک مسکراہٹ بڑی سے بڑی خفگی کو بے دست و پا کر دیتی تھی اور

دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں اُن کے سامنے بات بدل بدل گئی

والی صورت پیدا ہو جاتی تھی۔

سرور صاحب نہ صرف نئے ادیبوں کی ہمّت افزائی کرتے تھے بلکہ اُنہیں لکھنے کے لیے اُکساتے بھی تھے۔ کانٹ کے فلسفۂ اخلاقیات اور کروچے کے فلسفۂ جمالیات پر طویل اور تفصیلی لیکن کسی قدر عام فہم زبان میں مضامین (جو افسوس صباح الدین عمر مرحوم کے پاس سے کھو گئے[1])

---

[1] ان مضامین کے ساتھ من موہن تلخ کے نام یاس یگانہ چنگیزی کے خطوط بھی تھے جو ماہنامہ ''نیا دور'' میں اشاعت کے لیے میں نے تلخ سے منگوائے تھے۔ اُن دنوں صباح الدین عمر صاحب ہی ''نیا دور'' کے ایڈیٹر تھے۔

میں سے ایک سرور صاحب اور دوسرا احتشام صاحب کی فرمائش پر ہی لکھا گیا تھا، اگر چہ یہ بالکل یاد نہیں کہ کس مضمون کے لیے کس نے اُکسایا تھا۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے اور اُسے بیان نہ کرنے پر خود کو آمادہ کرنا مشکل معلوم ہو رہا ہے۔

انجمن کے جس جلسے میں یہ طے ہوا کہ میں کروچے کی جمالیات پر مضمون اگلے مہینے کے دوسرے اتوار کی میٹنگ میں پڑھوں گا، حسبِ معمول جمال بھی موجود تھے۔ مزاح نگاری شروع کیے اُنہیں زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور وہ احتشام صاحب اور سرور صاحب کی موجودگی میں خاموش اور مودّب بیٹھے رہتے تھے لیکن دوستوں کی محفلوں میں ہنسی مذاق کی صورتیں ضرور پیدا کرتے تھے، کبھی کبھی خود اپنی قیمت پر بھی۔۔۔۔ چند روز بعد جمال قاضی باغ میں میرے یہاں آئے، خاصی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں اور ہنسی مذاق کرتے رہے، پھر بولے ''اُستاد اپنے مضمون میں میرا خیال رکھیے گا۔'' میں اُن کی معصومیت پر ہنس دیا۔ اُن کا خیال تھا کہ جمالیات کے موضوع پر مضمون میں اُن کی تنقید اور تعریف کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ دوستوں میں اُن کا یہ خیال ہفتوں مذاق کا موضوع بنا رہا۔ برسوں بعد جب میں نے علی گڑھ میں سرور صاحب سے اس کا ذکر کیا تو وہ خوب ہنسے اور تھوڑے وقفے کے بعد اسے یاد کر کے ہنستے اور مسکراتے رہے۔

غالباً اُن دنوں جب سرور صاحب علی گڑھ منتقل ہونے والے تھے، کانپور کے ایک ادبی ماہنامے کے خاص نمبر میں عزیز احمد کا افسانہ ''تصویرِ شیخ'' شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ ہم میں سے بیشتر نوجوانوں نے پڑھا تھا اور پسند بھی کیا تھا لیکن اس کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ ایک دن کافی ہاؤس سے نکل کر احتشام صاحب اور سرور صاحب اور غالباً ایاز انصاری بھی تھے ''مے فیئر'' پکچر ہاؤس تک گویا چہل قدمی کرنے کے بعد پیدل ہی امین آباد کی طرف مڑ گئے۔ پیچھے پیچھے میں بھی تھا۔ مجھے وہ جگہ (نور منزل سے ذرا سا پہلے، سڑک کے بائیں جانب) اب تک اچھی طرح یاد ہے جہاں سرور صاحب نے اس افسانے کی خاصی تعریف کی تھی

اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس میں جگر اور اصغر گونڈوی کے تعلقات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ بات انہیں قطعاً پسند نہ آئی تھی۔

سرور صاحب بی۔ایس۔سی بھی تھے اور ظاہر ہے اُنہوں نے علم الحساب بھی پڑھ رکھا تھا۔اسی چہل قدمی یا سیر کے دوران انہوں نے الجبرا کے حوالے سے دو بھائیوں کا ایک واقعہ یا لطیفہ بھی بیان کیا تھا جس پر احتشام صاحب خوب ہنسے تھے۔اب سرور صاحب کی شیرینیٔ بیان کہاں سے لاؤں لیکن یہ لطیفہ سنانے سے خود کو روک نہیں پا رہا ہوں۔ دو بھائی تھے جنہیں الجبرا سکھانے کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ آخر ایک ایسے استاد کا انتظام کیا گیا جس کا دعوا تھا کہ وہ انھیں الجبرا سکھا دے گا۔اس نے ان بچوں کے شوق کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ دونوں کو بطخیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ چنانچہ بہت سی بطخیں پالی گئیں اور ان کے ذریعہ ماسٹر صاحب نے ابتدا حساب سے کی اور جوڑنے گھٹانے کا سلسلہ کئی ہفتے چلتا رہا جس کے بعد ایک دن اُنہوں نے بطخوں کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا اور ایک حصّہ کی طرف اشارہ کر کے کہا ''فرض کرو ان کی تعداد X ہے'' ''کیوں فرض کریں؟'' بڑے بھائی نے کہا ''ارے بھائی فرض کرلو، اس میں تمہارا نقصان ہی کیا ہے؟ یہ سنتے ہی چھوٹا بھائی بولا ''لیکن فائدہ بھی کیا ہے؟'' غرض دونوں نے ماسٹر صاحب کی بات مان کے نہ دی لیکن وہ اصرار کرتے ہی رہے۔ جب اُن کا اصرار بہت بڑھا تو چھوٹے نے بڑے بھائی سے کہا ''بھیا فرض نہ کرنا، ماسٹر صاحب کہیں کھیل ہی کھیل میں الجبرا نہ پڑھا دیں''

یہ لطیفہ جب یاد آتا ہے سرور صاحب کی ہنستی مسکراتی آنکھیں اور سرخ سپید چہرہ، ہونٹوں پر پان کی ہلکی سی لکیر، اور اندازِ گفتگو، ایسا کہ معلوم ہو منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں، یاد آجاتا ہے۔

سرور صاحب سے زیادہ خوش رُو، پُرکشش، خوش بیان و خوش گفتار پہلے بھی رہے ہوں گے، ہوسکتا ہے اب بھی ہوں لیکن سرور صاحب ایک ہی تھے، اُن جیسا دوسرا نہ تھا۔

سرور صاحب شاعر بھی تھے، اچھے شاعر، لیکن اُن کے تنقیدی اکتسابات نے شعری

کمال کو ڈھک لیا تھا اور ایسے اشعار بھی

دُنیا کی ترقّی خطِ معکوس نہیں ہے
جو آنکھ ہے ہشیار وہ مایوس نہیں ہے

اور

نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب وداماں میں
پرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی

------کم ہی لوگوں کو یاد ہوں گے۔

سرور صاحب سے آخری ملاقات ۸ مئی ۲۰۰۱ء کو ہوئی۔ بہت محبت سے پیش آئے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ اس دوران خرابیٔ صحت کے سبب تھوڑی دیر کے بعد کبھی گاؤتکیے سے ٹیک لگا لیتے، کبھی نیم دراز ہو جاتے اور بار بار معذرت کرتے جس سے شرمندگی ہوتی۔ کم از کم دو بار میں نے اُٹھنا چاہا لیکن اجازت نہ دی۔ میں نے ایک تصنیف کے بارے میں کوئی بات کہی، کہنے لگے مثال دے کر بتایئے۔ میں نے مثال دی۔ سوچتے رہے، پھر بولے ٹھیک ہے۔ شخصیت کے سارے کیل کانٹے ہموار ہو چکے تھے۔ ایک ایسے شخص کی بھی تعریف کی جس سے خاصے بدگمان رہتے تھے، خوشی ہوئی لیکن یہ احساس بھی کچوکے لگاتا رہا کہ چراغ کی لو مدّھم ہوتی جا رہی ہے۔

شیخ عبداللہ کی خودنوشت (آتشِ چنار) کے بارے میں ایک زمانے میں یہ خیال عام تھا کہ تحریر سرور صاحب کی ہے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور اس بارے میں دریافت کیا تو اُنہوں نے بتایا کہ شیخ صاحب نے سارے واقعات محمد یوسف ٹینگ کو املا کرائے تھے۔ میں نے صرف زبان و بیان کی نوک پلک درست کی تھی۔ یہ کہہ کر کچھ سوچنے لگے، سوچتے سوچتے یکایک مسکرائے اور بولے ''مسودہ میں ایک واقعہ ایسا بھی تھا جس کی نوعیت قطعاً ذاتی تھی اور اس کی

کوئی سماجی اور سیاسی اہمیت نہ تھی۔ خواہ مخواہ آ بگینوں کو ٹھیس بھی لگتی اور شاید نوبت کچہری عدالت کی آ جاتی۔ میری درخواست پر شیخ صاحب نے اسے حذف کر دیا تھا۔ وہ واقعہ یا مبینہ واقعہ بھی سُنایا لیکن اگر چہ اس کی حیثیت غلام گردشوں کی چہ می گوئیوں سے زیادہ نہیں، تاہم میرے لیے اسے بیان کرنا کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔

باتیں بہت ہو چکی تھیں اور تکان کے آثار ان کے چہرے پر نُمایاں ہونے لگے تھے۔ میں نے تیسری بار اجازت چاہی تو انہوں نے ایک خدمت میرے سپرد کردی کہ ڈاکٹر ایس۔ کے۔ نرائن اور ڈاکٹر نریش چندر کو ان کا سلام پہنچادوں اور یہ کام کرنے کے بعد اُن کو مطلع بھی کردوں۔ کاش یہ سعادت مجھے نصیب ہو جاتی۔ لیکن یہ خدمت میرے کیا کسی کے بس میں نہ تھی اور میں حقیقتِ حال بیان کر کے ان کی آزردہ خاطری میں اضافہ کا سبب نہیں بننا چاہتا تھا۔ چنانچہ نہایت سعادت مندی سے وعدہ کرلیا۔

کئی بار خیال آیا کہ وہ میرے خط کا انتظار کرتے ہوں گے اور شاید یہ بھی سوچتے ہوں گے کہ اتنا سا کام عابد سہیل کے سپرد کیا تھا۔ اس نے کر کے نہ دیا۔

دل مسوس کے رہ جاتا، اور کر بھی کیا سکتا تھا۔۔۔۔ آخر نو دس مہینے بعد یعنی ۱۰ر فروری ۲۰۰۲ء کو اُن کے انتقال کا علم ہوا تو پہلا خیال یہی آیا کہ اپنے نئے سفر میں اُنہیں وہ کام ضرور یاد ہوگا جو اُنہوں نے میرے سپرد کیا تھا اور جیسے ہی موقعہ ملے گا اپنے اُن عزیز ترین دوستوں سے ملاقات کر کے میری لاپروائی کی شکایت ضرور کریں گے۔

پنڈت آنند نرائن ملّاؔ

پنڈت آنند نرائن ملّاؔ کو پچاس پچپن سال قبل کی سردیوں میں پہلی بار دیکھا جب ماموں زاد بہن کی شادی کی تقریب کا دعوت نامہ اُن تک پہنچانے کی ذمّہ داری میرے سپرد ہوئی تھی۔ گولا گنج میں ان کا بڑا سا مکان جس بہت بڑی عمارت کا حصّہ تھا وہ ساری کی ساری سرخ تھی اور شاید اسی مناسبت سے ریڈ گیٹ کہلاتی تھی۔ غالباً اس زمانے میں بجلی کی گھنٹی کا رواج نہیں تھا یا ممکن ہے مجھے اس کا علم نہ رہا ہو۔ میں نے زنجیر کھٹ کھٹائی تو ملازم باہر آیا جس سے میں نے ملّاؔ صاحب کے بارے میں دریافت کیا اور کارڈ دے دیا۔

مجھے فوراً ہی واپس آجانا چاہیے تھا لیکن شاید اس خیال سے کہ کوئی جواب ملے یا معلوم نہیں کیوں میں کچھ دیر کھڑا رہا۔ اتنے میں کرتے پاجامے اور گرم سیاہ واسکٹ میں ملبوس ایک صاحب جن کا رنگ سرخ سپید تھا مکان سے برآمد ہوئے اور آنکھ کے اشارے سے اُنہوں نے دریافت کیا کہ کیا دعوت نامہ میں ہی لایا ہوں۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو مجھے اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ دروازہ ایک بڑے سے صحن میں کھلتا تھا جہاں ایک تخت پر سرخ کپڑوں میں ملبوس ایک خاتون انگریزی کا کوئی اخبار پڑھ رہی تھیں۔ نظر اُٹھا کر انہوں نے ہماری طرف دیکھا

اور پھر اخبار پڑھنے لگیں۔

بہت دنوں بعد معلوم ہوا کہ وہ یونیورسٹی کی مشہور و معروف طالبہ اور ملّا صاحب کی بیٹی چترا ملّا تھیں۔

ملّا صاحب مجھے سادگی سے سجے ہوئے اپنے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں لے گئے، علیم صاحب کو سلام کہلایا، شادی کی تقریب میں شرکت کا وعدہ کیا اور چائے پلانے کے بعد ہی رخصت ہونے دیا۔ یہ دن اتوار کا رہا ہوگا۔

میں اسی سال ہائی اسکول کا امتحان پاس کر کے لکھنؤ آیا تھا۔ یہاں کے اخلاق و آداب سے واقف نہ تھا، یہ تک نہیں جانتا تھا کہ ملّا صاحب کا شمار شہر کے ممتاز ترین وکیلوں میں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے میں نے اُن کی جانب اس عزّت واحترام کا مظاہرہ نہ کیا ہوگا جس کے وہ مستحق تھے، لیکن مجھ جیسے خام کار نوجوان سے وہ جس محبت سے پیش آئے اس سے بے حد متاثر ہوا تھا۔

ملّا صاحب کو پہچانا کئی برس بعد جب اُولڈ انڈیا کافی ہاؤس میں میرا آنا جانا شروع ہوا۔ کار کی چابی کی زنجیر ان کی اُنگلیوں میں رقصاں رہتی۔ ہر شخص اُن سے یونیورسٹی میں شعبۂ معاشیات کے سربراہ ڈی۔ پی۔ مکھرجی، ڈاکٹر عبدالعلیم اور نیشنل ہیرالڈ کے مشہور ایڈیٹر ایم۔ چلپتِ راؤ کی طرح عزّت واحترام سے پیش آتا۔ ایک ایک لفظ تول کے اُن سے گفتگو کرتا، مجاز اور سلام مچھلی شہری کے علاوہ جن کو سات خون معاف تھے۔

ملّا صاحب انجمن ترقّی پسند مصنّفین کے جلسوں میں شرکت کرتے، پابندی سے نہیں، لیکن اکثر و بیشتر۔ کبھی کبھی اُن کی دلیلوں میں قانون کی چھینٹ بھی نظر آتی۔

بعد میں بزمِ اَدب کے جلسوں میں جو سیّد صدیق حسن، حبیب احمد صدیقی، چند دوسرے آئی۔ سی۔ ایس افسران اور ملّا صاحب کے دولت کدوں پر ہوتے اور جن کے سلسلے میں امین سلونوی، رضا انصاری اور عمر انصاری صاحب خاصے سرگرم رہتے، کبھی کبھی میرا گزر بھی ہو جاتا۔ اسی انجمن کے ایک جلسہ میں اس وقت کے وزیر اعلا سمپورنانند نے اپنی غزل

سنائی تھی جو اُنہوں نے اُردو رسم الخط میں لکھی تھی اور بعد میں انہی کی تحریر میں اور ان کے دستخط کے ساتھ ''قومی آواز'' میں شائع ہوئی تھی۔ میں اُن دنوں اس اخبار میں سب ایڈیٹر تھا۔

ملّا صاحب یو پی ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے تو انہوں نے کافی ہاؤس اور ادبی نشستوں سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ سبب اس کا صرف یہ تھا کہ وہ عہدے کا وقار قائم رکھنے کے لیے ذرا الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے۔ اس میں کسی قسم کا غرور ہرگز شامل نہ تھا۔ ہائی کورٹ کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہونے کے شاید اگلے ہی دن وہ حسبِ سابق کار کی چابی کا چھلّا اُنگلیوں میں گھماتے، سفید شیروانی، سفید ٹوپی اور چوڑی دار پیجامے میں ملبوس کافی ہاؤس کچھ اس طرح آئے جیسے وہاں آنا اُنہوں نے کبھی ترک ہی نہ کیا ہو۔

شاعری، اُردو پرستی اور اپنے پیشے میں مہارت کے سبب وہ اہم شخصیت پہلے بھی تھے لیکن اس دوران جب وہ ہائی کورٹ کے جج تھے، ان کے ایک فیصلے نے جو یو پی پولیس کے خلاف تھا، انہیں یکا یک ملک گیر شہرت کا مالک بنا دیا۔ ان کا یہ فیصلہ شاہ سرخیوں کے ساتھ ہندوستان کے تقریباً سارے اخباروں میں شائع ہوا اور اس پر اداریے لکھے گئے۔

بعد میں سپریم کورٹ نے اس فیصلے کو مسترد کر دیا، لیکن اس سے ملّا صاحب کی شہرت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

اتفاق سے محمد نعیم نامی میرے ایک عزیز، جو مشہور صحافی لکشمی کانت تواری کے کلاس فیلو اور انہی کی طرح ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے، بطور پولیس انسپکٹر اس مقدمہ سے متعلق تھے اور ملّا صاحب کے فیصلے کا اصل نشانہ بھی وہی تھے۔ برسوں بعد میں نے ملّا صاحب سے نعیم صاحب اور اُن سے اپنے رشتہ کا ذکر کیا تو وہ یکا یک خاموش ہو گئے۔ چند لمحوں کے بعد اُنہوں نے کہا۔

''میں نعیم صاحب سے ملنا چاہتا ہوں''

میں نے یہ سوچ کر کہ نعیم بھائی کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے، ہامی بھر لی لیکن میری پریشانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب نعیم بھائی نے ملّا صاحب سے ملاقات کرنے سے انکار کردیا۔

کئی دنوں بعد جب میں ملّا صاحب کے یہاں گیا تو میرا خیال تھا کہ وہ اس بات کو بھول چکے ہوں گے، لیکن تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے پوچھا۔

''آپ نعیم صاحب کو نہیں لائے؟''

میں نے نعیم بھائی کے دوٹوک انکار میں گل بوٹے ٹانک کر نرم ترین الفاظ میں اُنہیں صورتِ حال سے مطلع کیا تو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن ان کے چہرے پر رنج وغم کی ایک ہلکی سی لکیر ضرور کھنچ گئی اور وہ میری جانب خالی خالی نظروں سے دیکھتے رہے۔ حالات کے اس غیر متوقع موڑ کے لیے میں قطعاً تیار نہ تھا، بے حد پریشان ہوگیا۔ میری پریشانی بھانپتے ہوئے اُنہوں نے کہا۔

''میں عدالت کے باہر اُن کا نقطۂ نظر جاننا چاہتا تھا۔''

جواب کیا دیتا، خاموش رہا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

برسوں بعد کانگریس نے شہر کے مشہور صنعت کار وی۔ آر۔ موہن کو ٹکٹ دیا تو ساری مخالف سیاسی جماعتوں نے، جن میں کمیونسٹ پارٹی پیش پیش تھی، ملّا صاحب کو بطور آزاد امیدوار لوک سبھا کا الکشن لڑنے کے لیے آمادہ کرلیا۔ میں اُن دنوں نیشنل ہیرالڈ میں سب ایڈیٹر تھا اور نیشنل ہیرالڈ کانگریس بلکہ نہرو خاندان کا اخبار ہونے کے باوجود وی۔ آر۔ موہن کی مخالفت کررہا تھا۔ اخبار کے ایڈیٹر چلپتِ راؤ (ایم۔ سی) نے کانگریس کے فیصلے کے خلاف اداریے بھی لکھے تھے اور کھل کر ملّا صاحب کی حمایت کی تھی۔ دلیل اُن کی یہ تھی کہ کانگریس میں سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کی بالادستی سے پارٹی کے اُصولوں کو ضرب پہنچے گی۔

اُن دنوں اندرا گاندھی وزیراعظم اور کانگریس کی صدر تھیں۔ کانگریس کو ووٹ دینے کی

اپیل پورے صفحہ کے اشتہار کی صورت میں بڑے روزناموں میں شائع ہوتی جس میں اندرا گاندھی کی تصویر اور عبارت تو وہی رہتی، بس حلقۂ انتخاب کی مناسبت سے امیدوار کا نام بدل جاتا۔ لکھنؤ اور کانپور کے علاوہ متعدد مقامات کے کانگریسی امیدواروں کے سلسلے میں اشتہارات برابر نیشنل ہیرالڈ میں شائع ہوتے رہے۔ چند دن بعد وی۔ آر موہن کو ووٹ دینے کی اپیل کا اشتہار آیا تو شعبۂ اشتہارات کے مینجر نے ڈرتے ڈرتے ایم۔سی سے ملاقات کے لیے وقت مانگا۔ یہ ملاقات اگلے دن ہوئی جس کے دوران انہوں نے کانگریس کا وہ اشتہار جس میں وی۔ آر۔ موہن کو ووٹ دینے کی اپیل کی گئی تھی انہیں دکھایا۔ اشتہار دیکھتے ہی ایم۔سی آگ بگولا ہو گئے اور اسے ردّی کی ٹوکری میں پھینکتے ہوئے اُنہوں نے انگریزی میں کہا۔

''اخبار کی پالیسی کے خلاف کوئی اشتہار نیشنل ہیرالڈ میں کیسے شائع ہو سکتا ہے؟''

چنانچہ یہ اشتہار نیشنل ہیرالڈ میں شائع نہیں ہوا اور ملّا صاحب کی انتخابی سرگرمیوں کی خبریں آن بان سے شائع ہوتی رہیں۔

اس واقعہ کا ملّا صاحب سے براہ راست تو کوئی تعلق نہیں لیکن اس سے ان دنوں کی سیاست، صحافت اور خود شہر لکھنؤ کا اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے، جس کی ایک اہم شخصیت آنند نرائن ملّا تھے۔ افسوس! اب یہ سب کچھ داستانِ پارینہ بن کر رہ گیا ہے۔

کمیونسٹ پارٹی سے تعلق اور ملّا صاحب سے تھوڑی سی قربت کے سبب اپنی بساط بھر میں بھی ان کی انتخابی مہم میں سرگرم تھا۔ ڈالی گنج کا سارا علاقہ وی۔ آر۔ موہن کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ اتفاق سے ڈالی گنج میں نعیم بھائی کا مکان فیض آباد روڈ پر تھا۔ اُن کے چھوٹے بھائی محمد سلیم ڈالی گنج کی ایک بے حد مقبول شخصیت تھے اور برسوں سے وہاں کی مشہور رام لیلا کمیٹی کے سب کچھ۔ چند ماہ قبل بطور آزاد امیدوار انہوں نے میونسپل بورڈ کی ممبری کے لیے الکشن لڑا تھا۔ ڈالی گنج کے دو رُکنی حلقے سے کمیونسٹ پارٹی نے سوہن لال اور شنکر لال کو اپنا امیدوار بنایا تھا۔ سلیم بھائی کے لیے ان میں سے ایک نشست جیت لینا کچھ ایسا مشکل نہ معلوم ہوتا تھا کیوں کہ شنکر لال مقابلتاً

کمزور امیدوار تھے۔ کمیونسٹ پارٹی سے اپنے تعلّق کی وجہ سے میں نے سوہن لال اور شنکر لال کے لیے کھل کر کام کیا تھا۔ سلیم بھائی کا سامنا ہو جاتا تو ایک عجیب سا احساس ہوتا لیکن نظریات کی لڑائی میں رشتہ داری کی کیا اہمیت؟ یادش بخیر وہ زمانہ سیاست تک میں نظریے کی بالادستی بلکہ حکمرانی کا تھا۔ سلیم بھائی صرف چند ووٹوں سے ہار گئے اور محلّہ والوں نے کہا کہ بھیّا، گھر کے داماد کی مخالفت کی وجہ سے ہار گئے۔

وی۔ آر۔ موہن رام لیلا کمیٹی کی خاصی مدد کیا کرتے تھے اس لیے سلیم بھائی سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ اس بات سے واقف ہونے کے باوجود میں نے ان سے مُلّا صاحب کی حمایت کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند دنوں کے بعد جب میں نے مُلّا صاحب کی انتخابی مہم کے سلسلے میں ڈالی گنج میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا تو اسٹیج میرے خسر محترم کے مکان کے چبوترے پر بنایا گیا۔ جلسہ شروع ہونے سے قبل یکایک میری نظر سلیم بھائی پر پڑی تو انہوں نے آگے بڑھ کر مجھ سے کہا۔

''عابد بھیّا! میں مُلّا صاحب کے لیے کام کروں گا۔''

سلیم بھائی، جو مجھے ہمیشہ عابد بھیّا ہی کہتے تھے، نہ صرف جلسے میں شریک ہوئے بلکہ انہوں نے اس کی صدارت کی اور مُلّا صاحب کی حمایت میں تقریر بھی۔ مُلّا صاحب کی تقریر تو نہایت عمدہ تھی ہی۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈور والی مسجد سے ڈالی گنج پل کے اطراف میں مُلّا صاحب کو بالادستی حاصل ہوگئی اور وی۔ آر۔ موہن کا گڑھ ٹوٹ گیا۔ لیکن ابھی اس واقعہ کا ذکر باقی ہے، جسے بیان کرنے کے لیے میں نے یہ سارا پس منظر پیش کیا ہے۔

برسوں پہلے میں نے نعیم بھائی کا ذکر کرتے ہوئے شاید مُلّا صاحب کو یہ بھی بتایا تھا کہ ان کا مکان ڈالی گنج میں ہے لیکن انھیں یہ قطعاً معلوم نہ تھا کہ سلیم بھائی نعیم صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔ جلسہ ختم ہوگیا تو دوسری باتیں کرتے کرتے مُلّا صاحب نے کہا۔

''نعیم صاحب شاید یہیں کہیں رہتے ہیں، میں جاؤں تو ملاقات ہوسکتی ہے؟'' میں کیا

جواب دیتا۔ اُن کے ساتھ نعیم بھائی کے گھر کی طرف جو بمشکل چند قدم کے فاصلے پر تھا چل پڑا۔ اتفاق سے نعیم بھائی موجود تھے۔ انھوں نے نہایت خندہ پیشانی سے ملاّ صاحب کا استقبال کیا اور چائے ناشتے سے تواضع کی۔ دورانِ گفتگو ملاّ صاحب کے استفسار پر نعیم بھائی نے کہا۔

''ہمارے لیے سچ اور جھوٹ کے پیمانے عام پیمانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ جب ہم کو کسی ملزم کے بارے میں یقین ہو جاتا ہے کہ مجرم وہی ہے تو اس پر الزام ثابت کرنے کے لیے جھوٹی گواہیاں تیار کرنے کو ہم غلط نہیں سمجھتے۔ کسی خونخوار مجرم کے خلاف کوئی شریف آدمی گواہی دینے کے لیے بھلا کیسے تیار ہوگا؟''

ملاّ صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن رخصت ہوتے وقت ہاتھ ملاتے ہوئے انہون نے نعیم بھائی سے کہا۔

''آپ بھی سچے، قانون بھی سچا۔''

لطف کی بات یہ ہے کہ اس ملاقات کے دوران انتخابات کے سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔

یہ تھے پنڈت آنند نرائن ملاّ۔

ملاّ صاحب کو دوسری ملک گیر بلکہ اُردو دُنیا گیر شہرت ان کے اس جملے کی وجہ سے ملی جس میں اُنہوں نے کہا تھا۔

''میں اپنا مذہب بدل سکتا ہوں لیکن اپنی زبان نہیں بدل سکتا۔''

یہ جملہ ملاّ صاحب کی اس عالمانہ تقریر کا حصّہ تھا جو انہوں نے اُردو متحدہ محاذ کانفرنس کے اس پلیٹ فارم سے کی تھی جہاں سے ایک بھی جذباتی تقریر نہیں کی گئی تھی اور اُردو کے مسئلہ کو عملی، اصولی اور منطقی نقطۂ نظر سے دیکھا اور پیش کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کانفرنس کی گونج ایوانِ اقتدار میں دیر تک سنائی دیتی رہی اور سچ پوچھیے تو اُردو کے حق میں ذاکر صاحب اور حیات اللہ انصاری صاحب کی قیادت میں لاکھوں دستخطوں کے حصول اور انہیں اس وقت کے صدر جمہوریہ

کی خدمت میں پیش کیے جانے کے بعد مدلّل طور پر اُٹھائی جانے والی یہ پہلی آواز تھی۔

اس کانفرنس کی تیاریوں کے دوران مجھے ملا صاحب کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا کیوں کہ اس سلسلے میں جو ۹ رُکنی کمیٹی بنائی گئی تھی اس میں آخری نام میرا ہی تھا۔ اُردو ملاّ صاحب کا جزوِ ایمان تھی۔ اس کانفرنس کی تیّاریوں کے دوران میں نے محسوس کیا کہ وہ ہر کام نہایت سلیقے سے کرتے تھے اور ایک ایک تفصیل پر اُن کی گہری نظر رہتی تھی۔ اُنہیں ہندی پریمیوں کے خدشات کا بھی احساس تھا چنانچہ اُردو کا مقدمہ اس قدر مدلّل اور غیر جذباتی طریقہ سے پیش کیا گیا کہ کسی ہندی پریمی کو اس کے خلاف آواز اُٹھانے کا موقع نہ ملا۔

مادری زبان اور مذہب کے رشتے کے حوالے سے ملاّ صاحب کا یہ جملہ الفاظ کی معمولی تبدیلیوں کے ساتھ دہرایا جاتا رہا ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ اُنہوں نے ان خیالات کا اظہار جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں تقریر کرتے ہوئے کیا تھا اور بعض دوسرے اسے جے پور کانفرنس سے منسوب کرتے ہیں جب کہ ان کا یہ جملہ رفاہ عام کلب کی اس کانفرنس کی دین ہے جس میں سید احتشام حسین، مولانا اسحاق سنبھلی، قاضی عدیل عباسی اور ڈاکٹر فریدی ایسے مستند ادیب اور سیکولر ذہنیت کے مالک افراد شریک تھے۔ یہ واقعہ غالباً اگست ۱۹۶۴ء کا ہے۔

ملاّ صاحب اتر پردیش اُردو اکادمی کی خشتِ اوّل رکھنے والوں میں شامل تھے اور ان کے دورِ صدارت میں اس ادارہ کی کی الگ ہی آن بان تھی۔ برسوں بعد اُردو اکادمی نے ''ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا'' کے جو نمونے پیش کیے ان کے پیش نظر اب اُس دورِ زرّیں کو یاد کرنا بھی مشکل ہے۔

بعد میں ملاّ صاحب دہلی منتقل ہو کر سپریم کورٹ میں وکالت کرنے لگے، کانگریس کے ٹکٹ پر دوبار راجیہ سبھا کے ممبر چنے گئے، انجمن ترقی اُردو (ہند) کے صدر رہے، ہندو پاک ٹریونل کے چیرمین مقرر ہوئے لیکن ان عہدوں سے اُن کی عزّت اور اُن کے وقار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا بلکہ سچ پوچھیے تو یہ ادارے اور عہدے ہی سرخرو ہوئے۔

ملّا صاحب فرد ہی نہیں، اپنی ذات سے انجمن بھی تھے، اُردو سے ان کی محبت عملی تھی، محض جذباتی نہیں۔ شاعر وہ بہت بڑے نہیں تھے۔ ان کی شاعری اور خاص طور سے نظموں پر اقبالؔ کا اثر دیکھا جا سکتا ہے، کہیں براہ راست اور کہیں کچھ اس قسم کا جس کے سبب شبلؔی سرسید اسکول سے متعلق گردانے جاتے ہیں۔

وہ مشاعروں کے شاعر نہ تھے تاہم ان میں شرکت کرتے تھے اور بیشتر صورتوں میں خاصے ناکامیاب ثابت ہوتے تھے۔ اُن کی ناکامی کا سبب اُن کی غزل یا نظم کا معیار ہرگز نہ ہوتا کیوں کہ خراب تخلیق پیش کرنے والے تک اکثر داد کے ڈونگرے بٹور لے جاتے ہیں۔ مشاعروں میں اُن کی ناکامی کا سبب ترنّم سے کلام سنانے پر ان کا اصرار ہوتا اور کمرۂ عدالت میں گونجنے والی اُن کی آواز مشاعروں میں جادو جگانے سے قاصر رہتی جس کے سبب اچھّے اشعار سُنا کر بھی وہ اکثر ہوٹ ہو جاتے۔

ملّا صاحب کو مشاعروں میں ہوٹ ہو جانا منظور تھا لیکن ترنّم کے بغیر، جسے مشکل ہی سے ترنّم کا نام دیا جا سکتا تھا، غزل سنانا منظور نہ تھا۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ آپ چاہیں تو باتیں کے بجائے ضدیں بھی کہہ سکتے ہیں۔

ملّا صاحب کے اُٹھ جانے سے ہم ایک ایسی شخصیت سے محروم ہو گئے جو شرافت، مروّت، اُردو پرستی اور لکھنوی تہذیب و اخلاق سے عبارت تھی۔ پنڈت سُندر لال کی طرح اب اُن کے ایسا اُردو کا دوسرا شیدائی شاید ہی ان آنکھوں کو دیکھنے کو ملے۔

▬ ▬

عشرت علی صدیقی

عشرت صاحب کو یادش بخیر، پچاس پچپن سال قبل پہلی بار اُس وقت دیکھا تھا جب وہ صلاح الدین بھائی کی بارات میں ایک طرح سے ہمارے گھر آئے تھے۔ یہ ''ایک طرح سے'' وضاحت طلب ہے۔ ہم لوگ قاضی باغ کی اختر منزل کے ایک حصّہ میں بطور کرایہ دار رہتے تھے۔ کرایہ دار ہم ضرور تھے لیکن ہر مہینے بہت تھوڑے سے روپے دینے کے علاوہ مالک مکان اور کرایہ دار کے درمیان تعلقات ایسے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ایک ہی خاندان کے لوگ کسی بڑے سے مکان کے دو حصّوں میں الگ الگ رہتے ہیں۔ مکان کے مالک داروغہ عبدالعلی کی دو لڑکیاں تھیں، زیبا اور شمسہ، جنہیں میں زیبا باجی اور شمسہ باجی کہتا تھا۔ شادی اس وقت زیبا باجی کی تھی۔

یہ تھا وہ پس منظر جس نے مجھے ''گھراتیوں'' میں شامل کردیا تھا۔

میں کسی بھی باراتی سے واقف نہ تھا لیکن بر جموہن ناتھ کاچرا اور مجید پرویز میں سے کسی نے، کہ یہ دونوں افسانہ نگار اور شاعر تھے، ایک ایک باراتی کو دُور ہی سے پہچنوا دیا تھا۔ تقریباً سارے ہی نام ایسے تھے جن کی چیزیں میں پڑھ چکا تھا۔ سلام مچھلی شہری، عشرت علی صدیقی،

صباح الدین عمر، کمال احمد صدیقی، چیتن سنگھ، شوکت صدیقی، منظر سلیم، سدا سرن مسرا اور کامریڈ شکیل کے نام یاد آ رہے ہیں۔ اِن کے علاوہ کچھ ایسے بھی تھے جن کو بعد میں دوسری طرح سے خوب خوب جانا۔ یہ تھے کالی شنکر شکلا، شریمالی، بابو لال ورما، تواری جی اور نعیم خاں۔ یہ سب کمیونسٹ تھے، ویسے جن لوگوں کا ذکر پہلے کیا ہے اُن میں سے بھی زیادہ تر کمیونسٹ ہی تھے لیکن ذرا کم سُرخ۔

داروغہ جی سفید بھک کرتا پیجامہ پہنے، بید کی بڑی سی کرسی پر دراز تھے اور باراتیوں کی آؤ بھگت میں دوسرے بہت سے لوگ لگے ہوئے تھے۔ میں بھی اُن میں شامل تھا۔

تھوڑی دیر بعد داروغہ جی نے مجھے اِشارے سے بلایا اور ایک صاحب کے بارے میں جو کھادی کی بھورے رنگ کی ذرا سی اُٹنگی شیروانی اور کھادی ہی کا کرتا پیجامہ اور ٹوپی پہنے ہوئے تھے پوچھا ''یہ کون صاحب ہیں''

''عشرت علی صدیقی'' میں نے کہا

''وہی عشرت علی جو 'دُنیا کا حال' لکھتے ہیں؟''

یہ تھا عشرت صاحب کے کالم کی مقبولیت کا عالم۔

برسوں بعد جب میں نے اُنگلی کاٹے بغیر خود کو ادیبوں میں شامل کر لیا تو ''قومی آواز'' آنا جانا شروع ہوا۔ اُس زمانے میں شہر کے ادیبوں کا ایک کعبہ ''قومی آواز'' بھی ہوا کرتا تھا۔ ایک دن جیسے یکا یک احساس ہوا کہ باہر کے لوگوں کی موجودگی میں عشرت صاحب اپنے کمرے سے نکل کر سب ایڈیٹروں کے کمرے میں آتے ہیں تو سب ایڈیٹر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان ادیبوں اور شاعروں سے اُنھیں کوئی مطلب نہیں اور وہ اپنے کام میں لگے ہیں، سر جھکائے ہوئے۔ اور اگر حیات اللہ صاحب اُدھر نکل آتے ہیں تو وہ لوگ بھی جواب تک کام میں مصروف تھے، اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کر باہر سے آئے ہوئے اُن لوگوں میں

شامل ہو جاتے ہیں جن سے حیات اللہ صاحب باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اُسی وقت اندازہ ہوا کہ عشرت صاحب ذرا سخت قسم کے آدمی ہیں اور پسند نہیں کرتے کہ ادیب و شاعر دفتر کے کام میں مخل ہوں۔

معاملہ اصل میں یہ تھا کہ اخبار نکالنے کی ذمہ داری عشرت صاحب کی تھی، حیات اللہ صاحب کی نہیں اور عشرت صاحب صحافی تھے اور صرف صحافی بلکہ فنافی الصحافت جب کہ حیات اللہ صاحب سیاستداں بھی تھے، ادیب بھی، پیر اک بھی اور مولوی بھی۔ ان دونوں کی جانب میرا رویہ کچھ اس قسم کا تھا۔ باخدا دیوانہ باشد، با محمدؐ ہوشیار

چند سال بعد یعنی ۱۹۵۵ء میں جب میں نے یونیورسٹی میں ''قومی آواز'' کے اعزازی رپورٹر بنائے جانے کی خواہش ظاہر کی تو غیر رسمی سا انٹرویو عشرت صاحب ہی نے لیا۔

''قومی آواز پڑھتے ہو'' اُنہوں نے پوچھا۔

''جی ہاں'' میں نے کہا

''اور''

''کبھی کبھی 'مِلاپ' اور 'پرتاپ' دیکھ لیتا ہوں''۔

''میرا مطلب انگریزی اخبار سے ہے''

''نیشنل ہیرالڈ''

خوش ہوئے۔

''مِلاپ'' اور ''پرتاپ'' روزانہ دیکھتے ہو؟''

''جی نہیں، کبھی کبھی۔۔۔۔ میرے محلّے میں ہومیو پیتھی کے ایک سندھی ڈاکٹر ہیں ان کے مطب میں آتا ہے۔''

''قومی آواز کی کیا بات پسند ہے؟''

یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ جو بات فوراً ذہن میں آئی کہہ دی۔ اتّفاق سے بہتر نکلی۔

''خبریں ایک سلسلے سے ہوتی ہیں،'' میں نے جواب دیا۔

کہنا یہ چاہتا تھا کہ کسی بڑی خبر سے متعلق جو چھوٹی چھوٹی خبریں ہوتی ہیں وہ اصل خبر کے ساتھ ساتھ لگی ہوتی ہیں لیکن اتنا لمبا جملہ اُس وقت بن نہیں پایا تھا۔ قاعدے کا اب بھی نہیں بن پایا ہے۔

تھوڑی دیر قبل درخواست میں نے شاید حیات اللہ صاحب کو دی تھی اور وہاں سے یہاں آگئی تھی کیوں کہ فیصلہ تو اصل میں عشرت صاحب ہی کو کرنا تھا۔

اُسی دن مجھے پروانۂ تقرری بھی مل گیا۔

ڈھائی سال کے بعد میں ''قومی آواز'' سے باقاعدہ طور سے متعلق ہو گیا۔ اُس وقت کسی انٹرویو کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

اب عشرت صاحب سے ملاقات تقریباً روزانہ ہونے لگی۔ کبھی کسی کام سے اُن کے پارٹیشن میں جانا ہوتا، کبھی وہ کوئی کاغذ ہاتھ میں لیے سب ایڈیٹروں کے کمرے میں آتے یا کاتبوں کے لمبے سے کمرے کی طرف جاتے یا ہم لوگ ''معشوق'' کے ہوٹل میں چائے پینے یا سگریٹ وغیرہ لینے باہر جاتے تو چق کے پیچھے اُن پر نظر پڑ جاتی۔ عام طور پر سر جھکائے ہوئے کچھ لکھتے یا میز کی دونوں جانب کسی قدر بے سلیقگی سے رکھّے ہوئے کاغذات میں کچھ تلاش کرتے ہوئے نظر آتے۔ اُن کا پارٹیشن حیات اللہ صاحب کے بڑے سے کمرے سے ملحق تھا۔ حیات اللہ صاحب وہاں بیٹھ کر اڈیٹوریل لکھتے، اخبارات پڑھتے، جو لوگ اُن سے ملنے آتے اُن سے بات چیت کرتے، کبھی گھنٹوں بیٹھتے اور کبھی بس اداریہ لکھ کر چلے جاتے۔ کبھی تو یہ تک ہوتا کہ ہم لوگوں کو پتہ ہی نہ چلتا کہ وہ کب آئے اور کب چلے گئے۔

''قومی آواز'' میں پہلے دن مجھے جو کاپی دی گئی وہ ٹھاکر حکم سنگھ سے متعلق تھی۔ انتخابات ہونے والے تھے اور کانگریس نے ٹھاکر صاحب کو ٹکٹ نہیں دیا تھا۔ اُنہوں نے نہ

صرف کابینہ بلکہ پارٹی تک سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ یہ خبر یو۔ پی۔ آئی کے ٹیلی پرنٹر سے آئی تھی اور مجھے اس کا ترجمہ کر کے سرخی لگانی تھی۔ اچھی تو کیا قابلِ قبول سرخی کی بھی اُمید شاید ہی کسی نے کی ہو۔۔۔۔اصل امتحان تو ترجمے کا تھا۔

اُس وقت تک میں کئی جاسوسی ناولوں کے ترجمے کر چکا تھا جن میں سے ایک میرے نام سے اور باقی فرضی ناموں سے شائع ہوئے تھے۔ چنانچہ مجھے ترجمہ کرنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوئی۔ عشرت صاحب نے ہی میرے ترجمے کی غلطیاں دُرست کیں اور یہ خبر اُن کی دو کالمہ سرخی کے ساتھ دوسری شاہ سرخی کی طرح شائع ہوئی۔

دو تین دن بعد منظر سلیم صاحب نے مجھ سے کہا ''آپ کا کام تو ہو گیا۔''

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

بولے۔ ''عشرت صاحب کہہ رہے تھے زیادہ تعریف نہ کرنا نہیں تو دماغ خراب ہو جائے گا''

یہ ایک طرح سے اشارہ تھا کہ تین مہینوں کے لیے جو عارضی تقرر ہوا ہے، کسی یقین دہانی کے بغیر، اس کے مستقل ہو جانے کے خاصے امکانات ہیں۔ لیکن یہ مدّت مزید تین مہینے کے لیے مزید بڑھا دی گئی اور چھے مہینے بعد فیصلے کی گھڑی آئی تو ایک اور صاحب جنہیں ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کے ایک ڈائرکٹر کی سرگرم حمایت حاصل تھی اُمیدوار کے طور پر میدان میں آ گئے۔

یہ اُمیدوار میرے دوست اور کمیونسٹ پارٹی میں میرے ساتھی نجم الحسن تھے۔

پچھلے چھے مہینوں کے دوران ''قومی آواز'' میں عام خیال یہی تھا کہ میرا مستقل کیا جانا محض ایک رسم کی ادائیگی ہے لیکن حالات یکا یک گڑبڑا گئے۔

میں نے عشرت صاحب سے ملاقات کی تو اُنہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے ذرا بھی اُمید بندھتی۔ اُن سے مایوس ہو جانے کے بعد میں نے حیات اللہ صاحب سے ملاقات کی اور جب اُنھوں نے مقابلے کی بات کہی تو میں نے ایک سخت بات کہہ دی اور ایک

عرصے تک یہی سمجھتا رہا کہ میرا مستقل کیا جانا اُسی کا نتیجہ ہے۔ لیکن بہت دِنوں بعد معلوم ہوا کہ اس معاملے میں دوسری باتوں کے علاوہ عشرت صاحب نے حیات اللہ صاحب سے یہ بھی کہا تھا کہ اِس جگہ پر عابد سہیل کے بجائے کسی اور کو لیا گیا تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم لوگوں نے دو دو غلطیاں کی تھیں ایک تو اُس وقت جب اُنہیں تین مہینے کے لیے رکھا تھا اور دوسری اُس وقت جب یہ مدّت تین مہینوں کے لیے بڑھائی تھی۔ بدنامی ہوگی سو الگ۔

عشرت صاحب نے اِس واقعے کا ذکر مجھ سے کبھی نہیں کیا۔ وہ اپنی نیکیاں نہیں گِناتے بلکہ خود بھی بھول جاتے ہیں۔ اور پھر یہ تو دفتر کا راز تھا۔۔۔۔ مجھے یہ بات بہت دِنوں بعد محمد حسن قدوائی صاحب نے بتائی تھی۔

عشرت صاحب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اُنہیں غصہ کبھی نہیں آتا۔ اِس لیے کسی سے جھگڑا نہیں ہوتا۔ لیکن ایک بار ہو ہی گیا۔

ہوا یہ کہ حیات اللہ صاحب ایک مہینے کے لیے مصر کے دَورے پر گئے ہوئے تھے۔ اِس دوران رضا صاحب کو عشرت صاحب کی کوئی اَدا ناگوار گزری اور اُنہوں نے اُن سے بات کرنا چھوڑ دی۔ حد یہ ہے کہ عشرت صاحب نے کبھی کچھ کہا، کوئی بالکل عام سی بات، تو اُنھوں نے جواب بھی نہیں دیا۔ عشرت صاحب نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی لیکن جب یہی کہانی بار بار دہرائی گئی تو وہ بھی خاموش ہو گئے، کیا کرتے۔

حیات اللہ صاحب واپس آئے تو رضا صاحب نے اُن سے عشرت صاحب کی سخت شکایت کی۔ اُنہوں نے سب کچھ صبر و سکون سے سُنا اور کہا ''دیکھوں گا''۔ پھر کسی موقعے سے اُنھوں نے عشرت صاحب سے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے۔ دو تین دن بعد حیات اللہ صاحب نے دونوں کو اپنے کمرے میں بلایا اور کہا کہ آپ لوگوں کو جو کچھ کہنا ہو ایک دوسرے کے سامنے کہیں۔ شکایتوں کی پوٹلی رضا صاحب نے کھولی۔ عشرت صاحب کی باری آئی تو اُنہوں نے کہا ''مجھے کوئی شکایت ہی نہیں، کیا کہوں''۔ رضا صاحب نے دیکھا کہ سارا معاملہ ہی ختم ہوا جا رہا ہے تو

اُنہوں نے اپنے حساب سے ایک بڑا تیر مارا، بلکہ دُور کی کوڑی لائے۔

بولے ''باقی باتیں تو کہہ ہی چکا ہوں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عشرت جن سنگھی ہے۔''

برسوں کی دوستی تھی۔ اِس طرح سے بات کرنے کا بھی اُنہیں حق تھا۔

حیات اللہ صاحب نے ہنستے ہوئے رضا صاحب سے کہا ''اور سب تو خیر ٹھیک ہے لیکن عشرت جن سنگھی کیسے ہوگئے۔''

''بالکل جن سنگھی ہے'' رضا صاحب نے اصرار کیا۔ ''اپنی کہے جاتا ہے دوسرے کی سنتا ہی نہیں۔''

حیات اللہ صاحب نے اتنے زور کا قہقہہ لگایا کہ وہ سارے سب ایڈیٹر جو اُس وقت ڈیوٹی پر تھے، اُن کے کمرے کی طرف لپکے۔ پیچھے پیچھے میں بھی تھا۔

عشرت صاحب کرسی پر سے اُٹھے، رضا صاحب کا ہاتھ تھاما اور بولے ''اماں چھوڑو، بس اتنی سی بات تھی تو مجھ سے کہہ دیتے، حیات اللہ صاحب کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی''

میرا خیال ہے اُس دن کے بعد اس واقعے کا ذکر آج ہو رہا ہے۔

''قومی آواز کے دفتر میں عشرت صاحب کا غصہ ایک جملے سے شروع ہوتا اور اُسی پر ختم ہو جاتا۔ وہ جملہ تھا ''چلو کام کرو، زیادہ بحث کی تو نیچے پھینک دوں گا''

دوسروں کے بارے میں نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے اُنہوں نے کئی بار چھجے سے نیچے پھینکا یا کم سے کم اس کی دھمکی دی۔ معلوم نہیں۔ نئی عمارت کے نیچے کے کمروں میں دفتر کی منتقلی کے بعد وہ سب ایڈیٹروں اور اسٹاف کے دوسرے لوگوں کو کہاں پھینکتے تھے؟

ایک دن قیصر تمکین جو قومی آواز میں مجھ سے سینئر تھے، یونیورسٹی سے واپسی میں دفتر آئے۔ اُن کے ہاتھ میں کارلائل پر کوئی کتاب تھی۔ دس پندرہ منٹ بیٹھے، کچھ ہنسی مذاق کیا، چہل بازی کی اور حسبِ عادت اپنا پسندیدہ سوال دہرایا ''زندگی میں کیا کھویا، کیا پایا؟'' اور چلے

گئے۔ رات کی ڈیوٹی تھی۔ لیکن غضب اُنہوں نے یہ کیا کہ دفتر کے باہر مدار بخش کو، جو قومی آواز کے سب سے پرانے چپراسی تھے، ایک دن کی چھٹی کی درخواست تھمادی۔

تھوڑی دیر بعد عشرت صاحب اُن کی چھٹی کی درخواست لیے ہوئے سب ایڈیٹرس کے کمرے میں آئے اور منظر سلیم سے مخاطب ہوئے۔

''یہ قیصر تمکین کو کیا ہو گیا ہے، رات کی ڈیوٹی ہے اور چھٹی کی درخواست بھیج دی؟''

''اُنہیں کارلائل ہو گیا ہے'' منظر سلیم نے کہا۔

عشرت صاحب نے کارلائل کے بجائے کالرا سُنا۔

''ابھی تو اچھے خاصے تھے'' اُنہوں نے حیرت سے کہا۔

بات آئی گئی ہوئی لیکن عشرت صاحب قیصر تمکین سے اُن کو کارلائل ہو جانے کا ذکر بہت عرصے تک کرتے رہے۔ ایک دن کسی بات پر اُن سے خفا ہوئے تو نہایت غصّے کے عالم میں بولے۔

''اب کارلائل ہوا تو نیچے پھینک دوں گا''۔

اس کے بعد کارلائل کا نام اُن کی زبان پر کبھی نہ آیا۔۔۔۔۔ اور آتا بھی کیسے؟ پھانسی کی سزا تو اُنہوں نے دے ہی دی تھی، اُس کے بعد بچا بھی کیا تھا؟ کیا دوسری بار پھانسی چڑھا دیتے؟

ایک اور دلچسپ واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے۔

ایک رات بارہ ساڑھے بارہ بجے اُنہیں دفتر میں دیکھ کر ہم سب حیران رہ گئے۔ محمد حسن قدوائی صاحب نے بہت بہت پوچھا لیکن وہ پھوٹ کے نہ دیے۔ اپنے کمرے میں جا کر کچھ کاغذات اُلٹے پُلٹے گویا کوئی ضروری کاغذ بھول گئے تھے اور چلے گئے۔ ہم لوگ بھی بھول گئے۔

بہت دِنوں بعد معلوم ہوا کہ اُنہوں نے خواب دیکھا تھا کہ ''قومی آواز'' کے دفتر میں

آگ لگ گئی ہے اور سب کچھ جل کر خاک ہو گیا ہے۔ بس اِسی پریشانی میں دفتر چلے آئے تھے۔ خواب سچّا بھی ہوتا تو وہ کیا کر لیتے؟ ظاہر ہے کچھ بھی نہ کر سکتے۔ لیکن ''قومی آواز'' عشرت صاحب کے لیے صرف اُن کا دفتر نہیں بلکہ سب کچھ تھا اور اس سب کچھ کو نذرِ آتش ہوتے ہوئے دیکھنے کے بعد بھلا اُن کو نیند آتی؟

اخبارات میں غلطیاں ہوتی ہی رہتی ہیں اور چوں کہ عشرت صاحب دفتر میں دن بھر رہتے اور یہ کہ اخبار کی ایک ایک سطر پڑھتے اِس لیے ظاہر ہے اُن کا خون زیادہ کھولتا اور شاید حیات اللہ صاحب نے اُن سے فرمائش کر رکھی تھی کہ میرے حصّے کا خون بھی تم ہی کھَولا لیا کرو، اس لیے وہ اُنہیں بھی نہ بخشتے جن کو سو خون معاف تھے۔ اور ''اُنہیں بھی'' کیا۔ بس لے دے کے ایک ہی صاحب تھے، نام تھا محمد متین۔ اُنہیں ضد تھی کہ جس بات کے لیے منع کیا جائے گا وہ ضرور کریں گے۔

''متین صاحب۔۔۔'' عشرت صاحب بائیں کان کے اُوپر اور ٹوپی کے نیچے سر کھجاتے ہوئے کہتے ''آپ سے کتنی بار کہا ''مہلوک'' کوئی لفظ نہیں ہے۔ لیکن آپ۔۔۔ آج بھی دو مقامی خبروں میں ہے''۔

متین صاحب نہایت اطمینان سے سر اُٹھاتے، قلم، دوات سے ٹکاتے اور بے حد مسکین صورت بنا کر اُن کی طرف دیکھتے۔ یہ مسکین صورت دراصل اِس بات کی علامت ہوتی کہ فسانے میں ذکر ہونے کے باوجود یہ بات اُن کو سخت ناگوار گزری ہے۔

عشرت صاحب اپنی بات دہراتے۔

متین صاحب اُن کو اُسی طرح ایک ٹک دیکھتے رہتے۔ کوئی جواب نہ دیتے۔

آخر تھک ہار کر عشرت صاحب اپنے کمرے میں چلے جاتے۔۔۔ ایک متین صاحب ہی اُن کی جان کو رونے والے تھوڑی تھے۔

یہ سب اپنی جگہ لیکن ''مہلوک'' اگلے دن بھی مقامی خبروں میں چمکتا ہوا نظر آتا۔ یہ قصہ بار بار دہرایا جاتا لیکن متین صاحب کی مسکین صورت ایسی ڈھال تھی کہ عشرت صاحب کے سارے تیر دائیں بائیں نکل جاتے ---- خیر، قواعد اور ڈکشنری کو گولی ماریے کہ تحقیق طلب امر یہ ہے کہ متین صاحب نے ''مہلوک'' میں کس نسل کے گولر کا پھول ڈال دیا تھا کہ پچاس سال ہونے کو آئے اور آج بھی یہ لفظ دہلی سے بنگلور اور کلکتہ سے ممبئی اور حیدرآباد تک ٹھسّے سے اخباروں میں شائع ہو رہا ہے۔

دو اور دلچسپ غلطیاں یاد آ رہی ہیں۔ ایک شنیدہ ہے اور دوسرے کے بارے کیا کہوں، معلوم ہو ہی جائے گا۔

مکین احسن کلیم انگریزی میں ایم۔اے ہونے کے علاوہ بے حد پڑھے لکھے آدمی تھے۔ اپنے کام میں ماہر اور ''قومی آواز'' میں پہلے دن سے چیف سب ایڈیٹر۔ غلطی ایسی تھی کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مکین صاحب سے ایسی چوک ہو سکتی ہے۔ ہوا یہ تھا کہ موسلا دھار بارش نے زبردست تباہی مچائی تھی۔ ٹیلی پرنٹر کی خبر میں غالباً **It rained in cats and dogs** رہا ہوگا جس کا ترجمہ اُنہوں نے بلّیاں اور کتّے برسے کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ بلّیاں اور کتّے سرخی میں بھی برسے تھے۔ لیکن اگلے دن صبح صبح دفتر آ کر مکین صاحب نے غلطی خود ہی درست کر دی تھی اور خود کو خوب خوب کوسا بھی تھا، نیشنل ہیرالڈ کے پہلے ایڈیٹر راماراؤ کی طرح۔ بس اپنے بال نہیں نوچے تھے۔

دوسری غلطی اس سے زیادہ دلچسپ تھی۔

کیرالا میں کمیونسٹ حکومت کے خلاف چرچ کی تحریک زور شور سے جاری تھی۔ ہر روز جگہ جگہ لاٹھی چارج اور فائرنگ ہوتی تھی۔ دفتر میں خاصا جونیئر ہونے کے باوجود یہ بھی ہوتا کہ محمد حسن قدوائی یا کوئی اور چیف سب اور سب ایڈیٹر چھٹی لے لیتا تو اخبار نکالنے کی ذمہ داری میرے سپرد کر دی جاتی۔ ایسی ہی ایک رات کی ڈیوٹی میں صفحہ اوّل پر کیرالا تحریک سے متعلق خبر

کی میں نے ایک نہایت شاندار سہ کالمہ سرخی لگائی تھی۔ سرخی یہ تھی۔

''کوٹا یم فائرنگ میں ہلاک ہونے والا چل بسا''

گھر جا کر نیند تو فوراً ہی آگئی لیکن رات بھر کوئی کہتا رہا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی بڑی غلطی ہوگئی ہے۔ خواجہ رائق کے یہاں باہر کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے اور سرہانے کا دروازہ جو گلی میں تھا کھلا رہتا۔ ہاکر ہاتھ بڑھا کر اخبار سرہانے رکھ دیتا تھا۔ جیسے ہی اس نے اخبار رکھا میری آنکھ کھل گئی۔ پہلی نظر غلطی پر ہی پڑی جو مونہہ چڑا رہی تھی۔

یونیورسٹی جاتے ہوئے دفتر چلا گیا، سُن گُن لینے۔ فضا میں کوئی تناؤ نہ تھا۔ رات میں ڈیوٹی پر آیا، کسی نے کچھ نہ کہا۔ ''غلطی اس قدر سنگین ہے کہ کسی کی نظر ہی نہ پڑی ہوگی۔'' میں نے سوچا اور مطمئن ہوگیا۔ لیکن اگلی رات مدار بخش نے جیب سے نکال کر ایک مڑا تڑا پرچہ دیا۔ عشرت صاحب نے لکھا تھا ''کل آپ کا آف ہے۔ ممکن ہو تو یونیورسٹی جاتے ہوئے یا واپسی میں مجھ سے مل لیجئے۔'' سمجھ گیا کہ کس لیے طلبی ہوئی ہے اور بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ فوراً ہی ہتھیار ڈال دوں گا اور یہی کیا بھی، پھر بھی عشرت صاحب کا غصّہ تھا کہ ٹھنڈا ہی نہیں پڑتا تھا۔ لیکن کب تک؟ پتّھر کا بت سر جھکائے سامنے بیٹھا ہو تو کوئی کب تک غصّہ کر سکتا ہے۔ آخر نارمل ہوگئے۔

معلوم نہیں کیسے مسیح الحسن صاحب کو میرے اس کارنامے کا علم ہوگیا تھا۔ ممکن ہے عشرت صاحب ہی نے ذکر کر دیا ہو لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اُنہوں نے مسیح صاحب سے کہا تھا کہ ''خواہ مخواہ بات پھیلانے کی ضرورت نہیں۔ ایک اپرینٹس کے ساتھ اخبار نکالا تھا۔''

عشرت صاحب کو جس نے کام کرتے نہیں دیکھا وہ اندازہ بھی نہیں کر سکتا کہ وہ کتنا کام کرتے تھے۔ پونے دس بجے کے قریب دفتر آجاتے۔ اخبار ایک بار پھر پڑھتے، اُس کے بعد سب سے پہلے خطوط کا پلندہ کھولتے، تقریباً ایک کالم کے خطوط ایڈٹ کرتے، ایڈیٹوریل کے صفحے کا کوئی مضمون موجود ہوتا تو اُس کی کانٹ چھانٹ کرتے، زبان دُرست کرتے، نہ ہوتا

تو خود ہی لکھ دیتے۔ نصیر ناطقی کو جو چیف پروف ریڈر تھے یا خنداں صاحب کو بلا کر کاتبوں کی پوزیشن معلوم کرتے، ضرورت ہوتی تو پرچہ لکھ کر چپراسی کو کسی کاتب کے گھر بھیجتے۔ اس طرح ساڑھے گیارہ بارہ ہو جاتا، حیات اللہ صاحب کے آنے کا وقت۔ وہ آجائیں تو پتہ چلے کہ اداریہ کون لکھے گا، وہ سوچتے، لیکن اس کام کے لیے ذہنی طور پر خود کو تیار بھی کر لیتے۔ سنیچر کا دن ہوتا تو اس انتظار کی ضرورت بھی نہ پڑتی کیوں کہ ''قومی آواز'' میں اتوار کو عشرت صاحب اور حیات اللہ صاحب کا تو آف ہوتا تھا لیکن اداریہ کو چھٹی اور پڑھنے والوں کو نجات اس دن بھی نہ ملتی۔ دوشنبہ کے اخبار کا اداریہ تو عشرت صاحب لکھتے ہی تھے لیکن حیات اللہ صاحب کہہ دیتے ''عشرت صاحب آج اداریہ آپ ہی لکھ دیجیے'' تو اُنھیں ایک دن میں دو دو اداریے لکھنے پڑ جاتے، ایک آدھ بار ضرورت پڑنے پر شاید ''گلوریاں'' بھی لکھی تھیں، ویسے یہ کام مجیب صاحب، بعد میں احمد جمال پاشا اور کبھی کبھی ''میزبان'' کے نام سے حیات اللہ صاحب بھی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ چپراسیوں کی چھٹیوں اور کاتبوں کی کارگزاریوں تک کا حساب کتاب عشرت صاحب ہی کو رکھنا ہوتا۔ کاتبوں کی فاضل کارگزاری کے دعووں کا مقابلہ اخبار میں شائع شدہ خبر کی ایک ایک سطر سے کرتے اور یہ بھی دیکھتے کہ اپنے معمول کے کام کو بھی فاضل کارگزاری میں نہ جوڑ دیا گیا ہو۔ اور یہ سب کیوں نہ کرتے؟ اخبار کے مفادات کی نگہبانی کا کام بھی تو اُنھوں نے کسی کے کہے بغیر اپنے سر لے رکھا تھا۔

نام نہاد اسلامی ممالک میں جہاں کبھی ایک عام آدمی خلیفۂ وقت سے پوچھ سکتا تھا: ''تمہارے پاس یہ دو دو چادریں کہاں سے آئیں'' جمہوریت نہ اب ہے نہ پچاس سال پہلے تھی۔ چنانچہ ہر چھٹے چھماہی کچھ نہ کچھ اُٹھا پٹک ہوتی ہی رہتی۔ اور کچھ نہ ہوتا تو محض اظہارِ وفاداری کے لیے غلامی کا ایک اور خوبصورت سا پٹہ زیبِ گلو کر لیا جاتا۔ امریکا، برطانیہ اور فرانس کے شیئر بازاروں اور اُن کی ''دلال اسٹریٹوں'' اور پیٹرول کی پائپ لائنوں سے ہوتے ہوئے

دس بیس ''فوجی قلعے'' اور ساز و سامان کسی نہ کسی ملک کے بادشاہ کی حفاظت کے لیے پائلٹوں اور اُن کی موٹی موٹی تنخواہوں کے ساتھ وہاں پہنچ جاتے۔ اس سب سے کسی دوسرے پاس پڑوس کے ملک کو خطرہ پیدا ہو جاتا اور یہی سب کچھ وہاں بھی ہوتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان ممالک کے عوام کو آسمانوں میں بربادیوں کے ان ''تذکروں'' کی سُن گُن بھی نہ مل پاتی کہ اخبارات فضائل ہی فضائل بیان کرتے، مسائل کا ذکر تک نہیں ہوتا۔ بھلا اس سب کا حساب کتاب کون رکھتا۔ لیکن عشرت صاحب رکھتے تھے اور اس طرح اُن کی حیثیت عرب ممالک کی **reference book** کی ہوگئی تھی اور اس سے چلپت راؤ بھی فائدہ اُٹھاتے۔

عشرت صاحب تام جھام کے قائل نہیں اور نہ اپنا ڈھول گلے میں لٹکائے رہتے ہیں اس لیے اُردو صحافت کو اُن کی ''دین'' سے لوگ ذرا کم ہی واقف ہیں۔ ''قومی آواز'' کا پہیہ ایسے چلتا کہ ''گِھر گِھر'' کی آواز تک نہ ہوتی جیسے کچھ ہو ہی نہ رہا ہو۔ کسی شور و غل، کسی افراتفری اور کسی ہنگامے کے بغیر، اور یہ کارنامہ تھا عشرت علی صدیقی کا۔ وہ جو جگر مراد آبادی نے کہا ہے۔

اسیر اس حسن سے کیا ہے کہ شورِ زنجیر پا نہیں ہے

کچھ وہی کیفیت تھی، ایک ذرا سے فرق کے ساتھ کہ نہ کوئی اسیر کیا جاتا، نہ کسی کے پیروں میں زنجیر ہی ہوتی۔۔۔۔ سبب اس کا یہ تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ دوسروں کا کام بھی نمٹا دیتے تھے۔ کسی چیف سب نے چھٹی لے لی تو وہ اخبار نکال دیں گے، سب ایڈیٹر کم پڑ گئے تو وہ خبروں کا ترجمہ کر دیں گے، دو تین کاتبوں نے چھٹی مار دی تو وہ دوسرے کاتبوں کو زیادہ کام کرنے پر راضی کر لیں گے، چپراسی کہیں گیا ہو تو مضمون، خطوط یا اداریہ خود ہی کاتبوں کو دے آئیں گے۔

۔۔۔اور چائے وہ عید بقر عید پیتے ہوں تو پیتے ہوں، دفتر میں تو پیالی کبھی اُن کی میز

پر دیکھی نہیں، پان کھاتے نہیں، سگریٹ پیتے نہیں، اس کے بعد کھانے کے لیے بچتا ہی کیا ہے، علاوہ غم کے، لیکن اس کے بارے میں کسی کو کچھ پتہ نہیں کیوں کہ اس طرح کی باتیں وہ ہزار پردوں میں رکھتے ہیں۔

کھانے پینے کے معاملہ میں عشرت صاحب اور حیات اللہ صاحب یعنی ''قدس'' اور ''روح القدس'' کی عادتیں بڑی حد تک ایک سی تھیں۔ دن کا کھانا دونوں نہیں کھاتے تھے، حیات اللہ صاحب یہ کمی چھاچ سے پوری کرتے تھے، عشرت صاحب چھاچ پھونک کر بھی نہیں پیتے تھے۔

ایک بات اور: عشرت صاحب شاعری نہیں کرتے، افسانے نہیں لکھتے، پیرا کی سے اُنہیں شوق نہیں، سیاست میں اُن کی عملی دلچسپی صرف ڈاکٹر سدّھو تک ہے، اور مولوی وہ ہیں نہیں، چنانچہ بس وہ ہیں اور صحافت، صحافت ہے اور وہ۔ اُن کا اور صحافت کا معاملہ، پانچ وقت کی نماز کے علاوہ ''من تو شدم، تو من شدی'' والا ہے۔

عشرت صاحب نوّے کے پیٹے میں ہیں۔ لکھنؤ میں صحافت سے اُن کا تعلق 'ہفت روزہ ہندستان'' جس کی داغ بیل ۱۹۲۷ء میں پڑی تھی۔۔۔۔۔۔ کے توسط سے قائم ہوا تھا، اُس سے پہلے وہ حیدرآباد میں قاضی عبدالغفار کے ''پیام'' میں تھے۔ اس تعلق کی مدّت دو ڈھائی سال بھی مان لی جائے تو وہ ۱۹۳۴ء سے صحافت سے متعلق ہیں، یعنی پورے ستّر سال سے۔

پنڈت نہرو نے آرام کو حرام ۱۹۵۲ء میں قرار دیا تھا، عشرت صاحب نے ۱۹۳۰ء سے ہی اُسے خود پر حرام کر رکھا ہے، اور تھکنا وہ جانتے نہیں۔

''قومی آواز'' سے سُبکدوش ہونے کے بعد سے اُنہوں نے اپنے لیے دوسری مصروفیات ڈھونڈھ لی ہیں اور اب بھی یہ عالم ہے کہ ہندوستان یا دُنیا کے کسی نہ کسی مسئلے پر وہ ہر روز ایک مضمون ضرور لکھتے ہیں جو ملک کے کسی نہ کسی یا کئی کئی اور چودھری شرف الدین

صاحب، جو بہت دنوں سے بندوق کے بجائے اپنے مضامین اور ادبی جلسوں سے نشانے باندھنے لگے ہیں، کے مطابق امریکا تک کے اخباروں میں شائع ہوتے ہیں۔ لوگ اُن مضامین سے اتفاق کرتے ہیں، اختلاف کرتے ہیں، خوش ہوتے ہیں، خفا ہوتے ہیں لیکن اُنھیں پڑھتے ضرور ہیں۔ اور دُنیا اب ایسی ہوگئی ہے کہ کم سے کم ایک بڑا مسئلہ ہر روز ضرور پیدا ہو جاتا ہے، اس لیے یہ اُمّید بے جا نہ ہوگی کہ جب تک ہر دن ایک مسئلہ پیدا ہوتا رہے گا عشرت صاحب اُس کو حل کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

گورا چٹا رنگ، بوٹا سا قد، کھدّر کا کرتا پیجامہ، اُس پر کھدّر ہی کی شیروانی اور سر پر سفید گاندھی ٹوپی، بالکل ویسے ہی ہیں جیسے پچاس سال قبل تھے، جب میں نے اُنہیں پہلے پہل دیکھا تھا۔ بس ذرا کمزور ہو گئے ہیں اور اس دوران کمزور کون نہیں ہوا، علاوہ جارج ڈبلو بش کے۔۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ ایک تبدیلی اور آئی ہے۔ کام، محنت، شرافت اور وقت کی پابندی سے خوش پہلے بھی ہوتے تھے لیکن کیا مجال تھی جو یہ خوشی ظاہر ہو جائے، اسی ڈر سے سر جھکا کر بات کرتے تھے، آنکھیں ملائے بغیر اور کان کے اُوپر اور ٹوپی کے نیچے سر کھجاتے رہتے تھے۔ اب کمزور ہو گئے ہیں، اس لیے خوشی ضبط نہیں کر پاتے اور تعریف کے بول مونہہ سے پھوٹ پڑتے ہیں۔۔۔۔۔ میں نے چلپّت راؤ پر مضمون لکھا تو اس خیال سے کہ کہیں کوئی بات خلاف واقعہ نہ لکھ گیا ہوں، اشاعت سے پہلے اُنہیں سُنایا۔ خوش ہوئے اور تعریف کی۔ میں اُنہیں حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ ''ہائے کس قدر کمزور ہو گئے ہیں'' میں نے افسوس کے ساتھ سوچا۔

دہلی اُردو اکادمی نے عشرت صاحب کو بہادر شاہ ظفر قومی ایوارڈ دے کر اُردو صحافت کی بہترین روایات اور اُن کے حوالے سے خود کو سُرخ رُو کیا ہے۔ اُردو صحافت ادب کی گود میں پروان ضرور چڑھی ہے لیکن اب اُس نے اپنی آزاد پہچان بنالی ہے اور اِس وقت اس زندہ اور تابندہ پہچان کے سب سے بڑے نشان کا نام ہے ''عشرت علی صدیقی''۔

یہی نام اس پن[1] چکّی کا بھی ہے جو اب بھی نہر پر چل رہی ہے۔ پہلے یہ نہر ''قومی آواز'' کے دفتر سے ہو کر بہتی تھی، اب اُن کے گھر سے ہو کر بہتی ہے اور لطف یہ ہے کہ چکّی کی ''پھک پھک'' کی آواز بھی سُنائی نہیں دیتی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم اُس کے اتنے عادی ہو چکے ہوں کہ اُس پر توجہ نہ کرتے ہوں۔

■ ■

---

[1] یہ خاکہ ''نہر پر چل رہی ہے پن چکّی'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

عابد پیشاوری

فروری ۱۹۹۹ء کے پہلے یا دوسرے ہفتہ کی بات ہے کہ ایک دن ڈاکٹر محمود الحسن نے پوچھا۔

''عابد پیشاوری صاحب کا کوئی خط آیا؟''

میں نے اس سوال کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی اور کہا۔

''تقریباً پندرہ دن قبل اُن کا خط ملا تھا، میں نے جواب لکھ دیا تھا، مل گیا ہوگا یا شاید ایک آدھ دن میں مل جائے۔ کیوں، کوئی خاص بات ہے؟''

''نہیں کوئی خاص بات نہیں۔'' انھوں نے کہا۔ ''خبر غلط ہوگی۔''

''کون سی خبر؟'' میں نے پوچھا

اُنہوں نے آہستہ سے کہا۔ ''ایک بُری خبر سنی ہے''۔

ڈاکٹر حنیف نقوی سے ڈاکٹر محمود الٰہی نے جنہیں کسی نے دہلی سے عابد پیشاوری کے انتقال کی غیر مصدقہ اطلاع دی تھی، اس بارے میں دریافت کیا تھا۔ نقوی صاحب نے محمود صاحب کو فون کیا تھا کہ شاید انھیں کچھ علم ہو لیکن اُنہیں بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ کسی اُردو اخبار میں بھی

اُن کی علالت تک کی کوئی خبر نہیں چھپی تھی۔ ہم دونوں نے اسے محض افواہ سمجھا، خود کو طرح طرح سے بہلانے کی کوشش کی اور اپنے حساب میں یہ بات قطعاً بھول بھی گئے۔

ڈاکٹر محمود الحسن کے جانے کے تھوڑی دیر بعد مجھے یکا یک احساس ہوا جیسے گلے میں کانٹا اٹک گیا ہو اور اس احساس نے عابد پیشاوری کی یاد تازہ کر دی۔ رات میں جموں فون کیا تو بھابھی صاحبہ نے کہا۔

''آپ کو نہیں معلوم؟''

گلے میں کانٹا پھر اٹک گیا اور میں ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔

''طبیعت تو کئی دن سے خراب تھی، لیکن نہ اُنہوں نے اسے کوئی اہمیت دی، نہ ہم لوگوں نے اور۔۔۔۔۔۔'' اُن کی آواز گلو گیر ہو گئی۔

'' کب۔؟'' میں نے پوچھا۔

۲۶ر جنوری کو، دن میں ساڑھے گیارہ بجے۔

خاموشی۔۔۔لکھنؤ میں بھی، جموں میں بھی۔۔۔۔میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔۔۔ بھابھی کی بھی رُندھی رُندھی سی آواز آئی لیکن وہ دو تین الفاظ سے زیادہ کچھ نہ بول سکیں، اور یہ الفاظ بھی سمجھ میں نہ آئے۔ دو تین منٹ تک ہم دونوں ٹیلی فون کانوں سے لگائے رہے۔ مجھے صرف سانسوں کی آواز سنائی دیتی رہی۔ شاید اُدھر بھی یہی حال رہا ہو۔ پھر دونوں نے جیسے ایک ساتھ ٹیلی فون رکھ دیا۔

۱۸ر جنوری کے خط میں اُنہوں نے لکھا تھا۔

''اس وقت سوا پانچ ہونے والے ہیں۔ تم نے کون سا روزہ رکھنا ہے جو سحری کر رہے ہو گے......میں بستر میں لحاف، کمبل، شال وغیرہ میں لپٹا بیٹھا ہوں، صبح سات بجے بجلی چلی جائے گی۔ پھر پانچ گھنٹے تک کچھ سجھائی نہ دے گا۔

دائیں پنڈلی میں سخت درد ہے۔ گرم پانی کی بوتل دھری ہے، اسی پر ہاتھ سینکتا جاتا ہوں اور دو دو لفظ لکھتا جاتا ہوں۔ رات بھر بخار میں پھنکتا رہا۔۔ ہمت کر کے ۴ بجے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا ہوں لیکن اب تک صرف دو رقعے لکھ پایا ہوں۔ آجکل اینٹ پتھر سے سر مارتا ہوں۔

میں کہاں اور یہ وبال کہاں''

پسِ نوشت:

''یہاں مارچ تک رہنے کی اجازت ملی ہے۔''

۲/اکتوبر کے خط کے تقریباً آخری جملے اس طرح تھے :

''میری پینشن کا فیصلہ ابھی تک نہیں ہوا۔ کچھ پریشانی اس طرف سے بھی ہے کہ ہاتھ میں دھیلا نہیں، سر پر چھت کیوں کر بنے گی۔ یہاں رہنے کی مدّت دسمبر تک ہے۔ اس میعاد میں توسیع خدا جانے ہوگی یا نہیں۔ بہر حال۔'ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا۔۔۔۔''۔

کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی تھا۔ لیکن ہوا وہ جو وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

نم آنکھوں اور ماؤف دماغ نے ماضی کے اوراق پلٹنا شروع کیے تو درجنوں، سیکڑوں نقوش ایک کے بعد ایک اُبھرے، کچھ واضح، کچھ دُھندلے اور کچھ ایسے جن کا ایک سرا پکڑنے کی کوشش کرتا تو دوسرا ہاتھ سے چھوٹ جاتا۔

کم و بیش چالیس سال قبل ''دانش محل'' میں احتشام صاحب نے، جو الٰہ آباد سے آئے ہوئے تھے، ایک شخص سے تعارف کچھ اس طرح کرایا تھا۔

''یہ ہیں عابد پیشاوری، جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے متعلّق ہیں۔ انشاء پر کام کر رہے ہیں، بے حد دیدہ ریزی سے۔'' اس کے بعد شاید دل رکھنے کے لیے ایک آدھ توصیفی جملہ میرے بارے میں بھی کہا۔ ماہنامہ ''کتاب'' کا ذکر کیا۔ میں نے اپنے نیم ہم نام کی جانب دیکھا۔

چھریرا بدن، چوڑی پیشانی، گندمی رنگ، اور اس قدر گھنی مونچھیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ چہرہ گردن کے بجائے ان ہی کے سہارے ٹکا ہوا ہے، بالکل عام آدمی معلوم ہوتے تھے۔ ذہن پر کوئی خاص خوشگوار تاثر مرتب نہ ہوا۔ لیکن چند ہی دنوں بعد ایک ایسا واقعہ ہوا کہ یہ مصرع ذہن میں گونج گیا

''تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد''

ایک دن احتشام صاحب نے عابد پیشاوری سے انگریزی کی ایک ایسی کتاب کا ذکر کیا جو اُنہوں نے دس پندرہ سال قبل پڑھی تھی لیکن اب اُنہیں نہ کتاب کا نام یاد تھا، نہ مصنف کا، ہاں یہ ضرور یاد تھا کہ کتاب لکھنؤ یونیورسٹی کی لائبریری سے حاصل کی تھی اور اس میں انشاء یا ان کے والد کا تذکرہ تھا۔ تین چار دن میں عابد پیشاوری نے وہ کتاب ڈھونڈھ نکالی۔ کسی انگریز مصنف کی یہ کتاب مرشد آباد کی تاریخ سے متعلق تھی اور اُس میں ایک معاہدہ کی تفصیلات درج تھیں جس پر کلاؤ نے (جو بعد میں لارڈ بنے) ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے، شجاع الدولہ اور جگت لال یا ایسے ہی کسی نام کے ایک شخص نے اودھ کی جانب سے اور نواب بنگالہ کی طرف سے انشا کے والد میر ماشاء اللہ نے دستخط کیے تھے۔ احتشام صاحب تو ان کی نرمیٔ گفتار اور گرمیٔ جستجو کے پہلے ہی سے قائل تھے، مجھ ایسے عامی پر بھی اُن کی دھاک بیٹھ گئی۔ ہم دونوں کے تعلقات کی ابتدا اسی دن ہوئی جو ''نہالِ غم'' نہ ہونے کے باوجود ان کی زندگی کے آخری لمحہ تک سرسبز و شاداب رہی۔

اسی دوران ایک اور واقعہ ہوا جس نے شہر کے ان ادیبوں کو بھی، جو آسانی سے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے، ان کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے ندوۃ العلماء کی لائبریری میں مصحفی کے تذکرے کا ایک ایسا نسخہ ڈھونڈھ نکالا جس پر خود مصنف کی بنائی ہوئی ترامیم کے علاوہ کہیں کہیں شبلی کی تحریر بھی موجود تھی۔

مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ غریب خانے پر وہ اس واقعہ کے بعد تشریف لائے تھے۔ تحقیق سے مجھے دور کا بھی علاقہ نہیں، ان کی اس تلاش کی داد کیا خاک دیتا لیکن وہ مجھے اچھے لگنے لگے تھے اور ہوتے ہوتے دوستی نے یہ شکل اختیار کر لی تھی کہ جب بھی لکھنؤ آتے، میرے

چھوٹے سے کرائے کے مکان کو اپنے قیام سے زینت بخشتے۔ ایک بار اہلیہ اور بیٹی (گڈو) کو بھی ساتھ لائے، کئی دن قیام کیا۔ میری اہلیہ اور بچوں کو ساتھ لے کر شہر کے سارے ہی تاریخی اور دوسرے اہم مقامات کی سیر کی اور کئی سال قبل تک، جب وہ آخری بار لکھنؤ آئے تھے، میرے ہی ساتھ قیام کرتے رہے۔

اُن کے نام کے ساتھ ''پیشاوری'' ہمیشہ اُلجھن پیدا کرتا رہا۔ پیشاوری تو سرخ وسپید ہوتے ہیں، وہاں کے سیبوں اور انار دانوں کی طرح اور شاید اسی سرخی کی مناسبت سے گرم مزاج بھی۔ ان کے گندمی رنگ اور نستعلیق شخصیت سے مجھے احساس ہوتا کہ اس میں ''مہاشیر'' کا سا کوئی پہلو ضرور ہے، جسے ایک عرصہ تک میں ''ببر شیر'' کا دوسرا نام سمجھتا رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے اور خاص طور سے اپنے خاندان وغیرہ کے بارے میں بات کرتے ہی نہ تھے۔ کئی بار ذکر چھیڑا مگر یا تو وہ ٹال گئے یا کوئی اور بات نکل آئی۔ تاہم تیں پینتیس سال کے تعلقات اور اس مختصر سے 'نوٹ' کی بنیاد پر جو میرے اصرار پر انھوں نے بھیجا تھا، جتنا بھی معلوم ہو سکا کچھ اس طرح ہے۔

عابد کی پیدائش صوبۂ سرحد کے ڈیرہ اسماعیل خاں میں والد کی وفات کے بعد ہوئی۔ وہاں اُن کا خاصا بڑا کاروبار تھا۔ لیکن جیسا کہ ہوتا آیا ہے، رشتہ داروں نے موقع سے فائدہ اٹھایا کیوں کہ ان کے پانچوں بھائی بہن صغرِسن تھے۔ والدہ کے سینے پر غم کی سِل تھی، ایسے میں وہ نومولود کی طرف کیا توجہ کرتیں۔ ان کی پھوپھی نے، جن کی پانچ اولادیں کم عمری ہی میں انتقال کر چکی تھیں، ان کی ایک بہن کی طرح اُنہیں بھی گود لے لیا اور اپنے ساتھ پیشاور لے گئیں۔ اس وقت وہ صرف دو مہینے کے تھے۔

گورے چِٹوں کے دیس میں غالباً رنگ کی مناسبت سے عابد کا نام کرشن کنھیا رکھا گیا جو بعد میں ''شیام'' میں تبدیل ہو گیا کہ کرشن جی کو پیار سے ''شیام'' بھی کہتے ہیں۔ عابد کے قلمی نام کے ساتھ ''پیشاوری'' دس گیارہ برسوں تک پیشاور میں قیام کی دین ہے (سرکاری کاغذات میں البتہ ان کا نام شیام لال کالڑا درج ہے)

تقسیمِ ہند کے بعد کی افراتفری اُنہیں دہلی لے آئی، جہاں ایم۔اے کرنے کے بعد اُنہوں نے تھوڑے عرصے تک بینک میں ملازمت کی۔ بعد میں اُن کا تقرّر جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ہوگیا۔ غالباً ۱۹۷۲ء میں ایک سے مِنار کے سلسلے میں جموں یونیورسٹی جانا ہوا تو انہوں نے علم، فن اور دوستی کے احترام میں بالترتیب ڈاکٹر محمد حسن، جوگیندر پال اور میری خاطر مدارات کچھ اس طرح کی کہ ان کی علم دوستی، فن نوازی اور خلوص کا نقش دل پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہوگیا۔

تقریباً آٹھ نو سال قبل افسانوی اَدب پر ریفریشر کورسیز کے سلسلے میں دوسری بار جموں جانا ہوا۔ اہلیہ بھی ساتھ تھیں۔ اسٹیشن سے سیدھے اپنے گھر لے گئے جہاں ایک کمرہ ہم دونوں کے لیے تیار تھا۔ اسی کمرے کے باہر کی ایک الماری میں اُن کی پوجا کی سامگری تھی۔ ہم لوگوں کے سوکر اُٹھنے سے پہلے ہی وہ پوجا کر لیتے۔ پکّے ہندو تھے، اپنے مذہب کے پابند، لیکن میرے اپنے تجربے کے مطابق اُن کے دماغ میں ''ہندو، نام کوئی اور'' کا گوشہ تک نہ تھا۔

پی ایچ۔ ڈی، کے زبانی امتحان یا سلیکشن کمیٹی کے سلسلے میں جب بھی بنارس جاتے، مجھے پہلے سے مطلع ضرور کر دیتے اور اسٹیشن بھی بلاتے۔ واپسی میں لکھنؤ میں قیام کرتے، لیکن سختی سے تاکید کر دیتے کہ انہیں لینے اسٹیشن نہ آؤں ''کون سا مشکل کام ہے۔ رکشہ پکڑ کر سیدھا کپور مارکیٹ (نخاس میں میرا گھر) آجاؤں گا۔'' اور ہوتا بھی یہی۔

چہرے پر علم کی چمک، جسم پر ذرا لمبے کرتے، چوڑی مہری کے پاجامے اور بڑی بڑی مونچھوں کے علاوہ، جو کم سے کم اوپر کے ہونٹ کو تقریباً ڈھکے رہتیں، ٹرانزسسٹر، چمڑے کا چھوٹا سا بیگ اور سبز رنگ کا تولیا ان کی پہچان تھے۔ بی، بی، سی سے لے کر ہندستان کے مختلف اسٹیشنوں سے انگریزی، اردو اور ہندی میں نشر ہونے والی خبروں کا تقریباً ہر بلیٹن وہ ضرور سنتے، لیکن کسی سیاسی مسئلے پر کبھی بات نہ کرتے۔ سیاست سے متعلق خبروں کا ردِّ عمل سب سے زیادہ ان کی مونچھوں پر نظر آتا جو کبھی خوشی سے پھڑ پھڑانے لگتیں اور کبھی غصہ سے تن جاتیں۔ لیکن مار پیٹ، فساد یا کسی حادثے کی خبر پر اُن کے چہرے کی طرح اُن کی مونچھوں پر بھی کوئی اثر

ظاہر نہ ہوتا۔

علی گنج کے مکان میں میرے منتقل ہونے کے بعد وہ چار بار آئے لیکن ہمیشہ کی طرح کچھ اس ادا سے کہ پانچ دس منٹ کے بعد معلوم ہوتا گویا مستقلاً یہیں رہتے ہیں۔ ٹرانزسسٹر کان سے لگائے ایک کمرے سے دوسرے کمرے کا چکّر لگایا کرتے۔ شیو کے لیے پانی خود ہی گرم کرتے۔ میری چھوٹی بیٹی جس سے ان کی جیسے دانت کاٹی دوستی تھی، ان کے ہاتھ میں مگ دیکھ کر کچن کا رخ کرتی تو ڈانٹ دیتے۔ اچّھے کھانے کے شوقین تھے، مچھلی خاص طور سے پسند تھی لیکن خوش خوراک نہ تھے۔ وہ آتے تو کم سے کم ایک بار مچھلی ضرور پکائی جاتی۔ ایک مرتبہ کانٹا گلے میں پھنس گیا تو سادی روٹی کے لقمے کھا کھا کر اس سے نجات حاصل کی۔ انیس نے گرما گرم روٹیاں اُن کے سامنے کی پلیٹ میں رکھیں، تو ہنس کر بولے۔

''پیٹ تو کانٹا نکالنے کے چکّر میں بھر گیا، اب کیا خاک کھاؤں'' لیکن مچھلی کی موجودگی انہیں مزید ایک ڈیڑھ روٹی کھانے سے نہ روک سکی۔

ہم لوگ انہیں انشاؔ سے زیادہ ہومیو پیتھی کے ڈاکٹر کے طور پر جانتے تھے کہ وہ انشاؔ کا کبھی ذکر تک نہ کرتے۔ ہاں اس طریقِ علاج کی خوبیاں خوب خوب بیان کرتے، جس میں ان کی ''فتوحات'' کا بھی ذکر ہوتا۔ فلاں شخص برسوں سے بیمار تھا، دو خوراک میں ٹھیک کر دیا۔ بخار، وہ چٹکی بجاتے، یوں ہوا ہوتا ہے۔ اور جوڑوں کا درد۔۔۔۔۔ اس سلسلے میں گیان چند جین صاحب کا بھی نام لیتے جو کبھی ان کے زیرِ علاج رہ چکے تھے۔ ہم لوگ بھی مختلف بیماریوں اور ان کی دواؤں کے نام نوٹ کرتے، نہایت سنجیدگی اور اہتمام سے، اور پھر اسی سنجیدگی اور اہتمام سے انہیں بھول بھی جاتے۔

لیکن پھر نہ جانے کیسے ہومیو پیتھی کا بھوت سر سے اتر گیا۔ اگلی بار آئے تو جسم کے مختلف حصّوں، خاص طور سے نسوں اور ہتھیلی پر، دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے سے دباؤ ڈال کر علاج کرنے کے زبردست مؤید بن چکے تھے۔ عابد پیشاوری کے پیشِ نظر اجزا نہیں، نظام رہتا تھا۔

اس طریقِ علاج کا فلسفہ سمجھایا۔ فلاں نس کا تعلق دماغ سے ہے، فلاں کا دل سے، یہ نس دبایئے تو بجلی کی ایک لہر گھٹنوں سے ہوتی ہوئی پیروں کی انگلیوں تک جاتی ہے جس سے خون کا دباؤ بڑھتا ہے اور فاسد مادّہ جل جاتا ہے۔ مجھے چپکے چپکے اخبار پڑھتے دیکھا تو اسے موڑ کر پاس کی کرسی پر پھینک دیا اور کہا۔

"اخبار نویسوں میں یہی خرابی ہوتی ہے کہ ہر لحظہ تبدیل ہوتے ہوئے حالات کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں اور دائمی سچائیوں پر توجہ نہیں دیتے"۔

"یہ چار دن کی بیماری دائمی سچائی کیسے ہوگئی؟" میں نے کہا

"ہوتی ہے، ہوتی ہے۔ تکلیف کے وقت احساس ہوتا ہے کہ اس سے بڑی حقیقت کوئی نہیں۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انیس کچن میں چلی گئیں لیکن زرّین چپکے چپکے مسکراتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد جب انہوں نے انگلیوں میں درد کی شکایت کی تو میری بیٹی نے کہا۔

"درد ورد کچھ نہیں، یہ جو آپ ہر وقت انہیں جگہ جگہ سے دبایا کرتے ہیں اسی کا نتیجہ ہے۔"

خفا ہو گئے۔ ان کے حکیم حاذق ہونے پر کسی کو شک کرنے کا کیا حق تھا۔ پھر ایک دم ہنسنے لگے لیکن سب سے زیادہ ان کی مونچھیں ہنسیں۔۔۔۔ ڈوبتی، ابھرتی مونچھیں۔ ہنستے ہنستے ایک دم سنجیدہ ہو گئے اور گھٹنوں پر دونوں ہاتھ مارتے ہوئے بولے۔

"یہ علاج نہ کر رہا ہوتا تو ہل بھی نہ پاتا۔"

اگلے دن میں نے شعری مجموعے کی یاد دلائی۔ کچھ جواب نہ دیا۔ پھر میں نے ان دوہوں کا ذکر کیا جو انہوں نے جموں میں خوب خوب سنائے تھے۔ بہت خوش ہوئے اور بولے "ہاں بھئی اب انہیں چھپ جانا چاہیے" پھر سات آٹھ نئے دوہے سنائے۔ میں نے تعریف کی، مونہہ دیکھی نہیں، واقعی بہت اچھّے تھے۔ پہلے خوش ہوئے پھر ہنسے اور ذرا کی ذرا میں سنجیدہ ہو گئے۔

"تم افسانہ وفسانہ لکھ لیتے ہو، اس کے بارے میں باتیں بھی بنا لیتے ہو، دوہوں کے بارے میں کیا جانو۔"

"جناب میں نے انشاء کے ڈاکٹر کی شاعری کا انتخاب کیا ہے۔" میں نے کہا۔

گھور کے دیکھا، کھا جانے والی نظروں سے۔ ذرا دیر بعد مسکرائے اور بولے "چلو میری نظمیں، غزلیں پڑھ کر تمہیں شاعری کی کچھ سمجھ تو آئی۔"

قصّہ اصل میں یہ تھا کہ دو تین سال قبل ایک دن نہ جانے کس ترنگ میں انہوں نے اپنی شاعری کا ذکر کیا تھا جو میرے لیے خبر کی حیثیت رکھتی تھی۔ میں نے ان کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی لیکن انہوں نے مشاعروں میں دھومیں مچانے کا ذکر کیا تو میں نے کہا انہیں چھپوا کیوں نہیں دیتے۔

"ہوں"۔ انہوں نے واؤ کو کھینچتے ہوئے کہا۔ لیکن بات آگے نہ بڑھ سکی، یا تو کوئی آ گیا تھا یا گفتگو نے کوئی دوسرا رُخ اختیار کر لیا تھا۔

مہینے سوا مہینے بعد ڈاک سے ایک موٹا سا پارسل آیا۔ اسے کھولا تو فل اسکیپ سائز کے دو سوا دو سو اوراق برآمد ہوئے جن کے دونوں طرف نظمیں اور غزلیں تھیں، بعض صفحات میں تو حاشیوں تک پر اشعار تھے۔ ساتھ میں خط بھی تھا۔

"جو کچھ مل سکا بھیج رہا ہوں۔ بہت سارا کلام ضائع ہو گیا، کیوں نہ یہ سب کچھ کلیّات کے طور پر چھاپ دیا جائے۔"

میں نے بیس پچیس صفحات روزانہ پڑھنے شروع کیے۔ تیس چالیس غزلیں تو واقعی بہت اچّھی تھیں۔ یہی حال نظموں کا بھی تھا، جن میں سے بہت سی ایسی تھیں جن کی حیثیت بالکل ذاتی تھی۔ کُل ملا کر بڑے سائز کی کتاب کے ایک ہزار صفحات کا مسالہ تو تھا ہی۔

میں نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے انہیں لکھا کہ کلیّات تو سب سے آخر میں چھاپا جاتا ہے، آپ اس سے آغاز کر رہے ہیں۔ کیوں نہ پہلے منتخب غزلیں چھاپی جائیں، پھر نظمیں اور اس کے بعد دوسری چیزیں۔ اور یہ کہ شعری مجموعہ ڈیڑھ سو صفحات سے زیادہ کا نہیں ہونا چاہیے۔

انھوں نے ساری تجویزیں نہ صرف مان لیں، بلکہ انتخاب کا کام بھی میرے سپرد کر دیا اور میں نے ایک چوتھائی سے بھی کم کلام کا انتخاب کر کے مسودے تیار کیے اور انھیں بھیج دیے۔ کوئی جواب نہ آیا، مہینوں تک ڈکار نہ لی۔ میں سمجھا ناراض ہو گئے۔ خطوط لکھے لیکن جواب ندارد، اور جب عید میں ان کا ایک سطری خط بھی نہ آیا تو میرا شبہ یقین میں تبدیل ہو گیا۔ میں نے خیریت دریافت کی۔ فوراً جواب آیا۔ بظاہر محبت سے بھرا ہوا، لیکن ایک ایک لفظ خفگی کی چغلی کھا رہا تھا۔ ''فلاں نظم تم نے قلم زد کر دی، تمھیں نہیں معلوم میرا بچپن کا دوست ہے، سخت بیمار ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ یہ نظم چھپی ہوئی دیکھ لے، بے حد عمدہ آدمی ہے۔ اور ہاں جو غزلیں تم نے مسترد کر دی ہیں ان میں آٹھ دس تو معرکے کی ہیں۔ دہلی کے مشاعروں میں جب یہ غزلیں پڑھی تھیں تو چھتیں اُڑ گئی تھیں''۔

میں نے جواب میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا کہ

''چھتیں اس لیے اُڑ گئی تھیں کہ وہاں چھتیں تھیں ہی نہیں۔''

میں سمجھتا تھا کہ بے حد خفگی بھرا خط آئے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اُنھوں نے بہت پیار بھرا خط لکھا جس میں ایک جملہ تھا۔

''تم کیا جانو، ان نظموں اور غزلوں سے کیسی کیسی کہانیاں وابستہ ہیں، ظالم! تو نے محبت کی ہی نہیں۔'' جملہ کا آخری حصہ پڑھ کر میں خوب ہنسا تھا۔

ایک دن ہم دونوں کے مشترک دوست اور لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ سیاسیات کے سربراہ ڈاکٹر سعید کا فون آیا۔

''آپ کے لیے جموں سے کچھ لایا ہوں۔ کب ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''کب کیا''۔ میں نے جواب دیا۔ ''میں گیا وقت ہوں نہ بڑا آدمی۔''

دو دن بعد ملاقات ہوئی تو انھوں نے ایک لفافہ دیا۔ میں نے اسی وقت کھولا تو دو ہزار روپے برآمد ہوئے۔ ساتھ میں کوئی تحریر بھی نہ تھی۔ ڈاکٹر سعید سے دریافت کیا، معلوم ہوا کچھ کہا

بھی نہیں تھا، علاوہ اس کے کہ خط لکھیں گے۔ میں نے خط لکھا تو جواب آیا ''جلد ہی آؤں گا۔''

چند دنوں بعد بذریعہ تار لکھنؤ آنے کی اطلاع دی اور آ بھی گئے۔ میرے علی گنج کے مکان میں یہ ان کی تیسری تشریف آوری تھی۔ پہلی بار بغیر کسی دقّت کے چار باغ سے سیدھے پہنچ گئے تھے، دوسری بار مکان کے پاس والے چوراہے سے رکشہ لے کر دوسری طرف نکل گئے تھے، لیکن ایک گھنٹہ بعد گھر ڈھونڈھ نکالا تھا۔ تیسری بار جب آئے تو مجھ سے فون کے ذریعہ رابطہ قائم کرنا ممکن ہو چکا تھا۔ ہم سب انتظار کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی، معلوم ہوا کہ گھنٹہ بھر سے میرا نام اور حلیہ بتا کر پتہ دریافت کر رہے ہیں، کوئی بتا کر ہی نہیں دیتا۔ بھلا کوئی بتا تا بھی کیسے؟ ایک تو کالونیوں میں ''کسے را با کسے کارے نہ باشد'' والی کیفیت ہوتی ہے اور دوسرے کوئی بھلا مجھے کیوں جانتا۔ لیکن وہ بہت خفا تھے۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ جس سے وہ واقف ہیں اسے ہر شخص ضرور جانتا ہو گا۔ خیر۔ ان کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق وہ بمشکل ڈھائی تین سو گز دور چوراہے پر تھے۔ میں پہنچا تو دیکھا، ٹرانزسٹر کان سے لگائے کھڑے ہیں، اٹیچی زمین پر رکھی ہے، ایک جھولا کندھے پر جھول رہا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔ ''وہ ڈائری بھول آیا جس میں پتہ لکھا تھا''۔

مونہہ ہاتھ دھو کر چائے پینے بیٹھے تو باتیں کرتے کرتے یکا یک ہنسنے لگے اور بولے۔

''ڈائری بھولا نہیں تھا۔ جان بوجھ کر چھوڑ آیا تھا کہ اب اس کی کیا ضرورت۔''

ہم لوگ بھی خوب ہنسے۔ چوتھے دن جموں روانہ ہوتے وقت اسٹیشن پر انہوں نے کہا۔

''اب میں علی گنج کے چپّے چپّے سے واقف ہو چکا ہوں۔ تمہارے گھر تو آنکھ بند کر کے بھی پہنچ سکتا ہوں۔''

میں نے ازراہِ مذاق کہا۔ ''یہ علی گنج ہے، انشاء پر تحقیقی مقالہ نہیں۔'' گھور کے دیکھا اور بولے۔ ''اگلی بار اطلاع بھی نہ دوں گا، یکا یک نازل ہو جاؤں گا۔'' اتنے میں انجن نے سیٹی دی اور وہ اُچک کر گاڑی پر سوار ہو گئے۔

بعد میں کِیا انھوں نے وہی جو کہا تھا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک دن فون کی

گھنٹی بجی۔ آواز میں نے فوراً پہچان لی اور پوچھا۔

''آپ کہاں ہیں۔؟''

''آئی۔ٹی کالج چوراہے پر۔''

''آپ کی عمر اب اس چوراہے پر کھڑے ہونے کی نہیں ہے۔''

شاید انہیں نہیں معلوم تھا کہ آئی۔ٹی لڑکیوں کے مشہور کالج کا نام ہے، اس لیے میرے مذاق کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور کہا۔

''بھائی یہیں کہیں تو تمہارا گھر ہے۔''

میں جا کر انہیں لے آیا۔

اس بار دوہوں کا مسودہ بھی ساتھ لائے تھے۔ ڈاکٹر شمیم حنفی نے ایک عالمانہ مقدمہ لکھا تھا۔ میں نے مسودہ دیکھا اور کہا۔

''مالی معاونت کے لیے فارم پر دستخط کر دیجئے گا۔ میں جمع کر دوں گا۔''

''کرم ہوگا''۔ انہوں نے کہا تو میں نے اس جملے پر، جس سے غیریت کی بو آرہی تھی، سخت احتجاج کیا۔ وہ ہنسنے لگے۔

''بھائی، بنارس سے لکھنؤ تک جو صاحب سامنے والی برتھ پر قابض تھے، یہ ان کا تکیۂ کلام تھا۔''

''تکیہ تو ساتھ نہیں لے آئے؟'' میں نے پوچھا۔

خوب ہنسے۔ ''کلام ہی نے تمہیں خفا کر دیا۔ تکیہ لے آتا تو تم گھر میں داخل بھی نہ ہونے دیتے'' یہ کہہ کر انہوں نے یکایک موضوع بدل دیا۔ ''اس مقدمہ کی کوئی نقل میرے پاس نہیں ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں نقل کرلوں گا۔'' اور یہی انہوں نے کیا بھی۔ دس بجے رات ہی سے اونگھنے لگتے تھے، اس رات معلوم نہیں سوئے بھی یا نہیں۔

رخصت ہوتے وقت کہنے لگے ''یہ ایک ہزار رکھ لو''۔ روپے دیے پھر پانچ سو اور دیے۔ میں نے کہا۔

''ساڑھے تین ہزار ہو گئے۔''

''ساڑھے تین!'' وہ حیرت سے بولے۔ ڈیڑھ ہزار ساڑھے تین کیسے ہو گئے؟''

پہلے والے دو ہزار انھیں قطعاً یاد نہ تھے۔ بڑی مشکل سے یاد آئے۔

دوہوں کی کتابت مکمّل ہوئی تو اندازے سے کہیں کم صفحات ہوئے۔ مالی اعانت شاید ایک سو چوالیس صفحات کے لیے تھی۔ میں نے فون کیا تو بولے۔

''تم ہی کچھ لکھ دو۔''

''میں کیا لکھ دوں۔؟''

''ارے بھئی کچھ بھی۔''

''کچھ بھی تو لکھتا ہی رہتا ہوں، لیکن آپ کی کتاب خراب کرنا نہیں چاہتا۔''

''میرے ہی بارے میں لکھ دو'' ۔انھوں نے کہا

''آپ کے بارے میں ۔۔۔ میں کچھ زیادہ جانتا بھی تو نہیں'' اور یہ بات سچ بھی تھی۔ اِدھر اُدھر کی کچھ باتیں ضرور معلوم تھیں لیکن بچپن، تعلیم، شادی، ملازمتوں اور انعامات و اعزازات کے بارے میں کبھی انہوں نے کچھ بتایا ہی نہ تھا۔

''آپ ایسا کیجیے، اپنے بارے میں موٹی موٹی باتیں لکھ کر بھیج دیجیے۔ میں نے کہا۔

''یہ کون سا مشکل کام ہے'' انہوں نے جواب دیا۔ ''ویسے اپنے بارے میں کبھی کچھ لکھا نہیں ۔تم ایسا کرو کہ تمہاری اکادمی نے ایک کتاب چھاپی تھی جس میں ادیبوں نے اپنے حالات زندگی لکھے تھے۔ اس کے لیے میں نے بھی کچھ گھسیٹ دیا تھا، اسے دیکھ لو۔''

میرے متعدّد تقاضوں کے بعد انہوں نے ''یہ کون سا مشکل کام'' کر تو دیا، لیکن اس مختصر سے نوٹ میں جو کچھ تھا اس سے حالاتِ زندگی کی کوئی عمارت تعمیر کرنا ممکن نہ تھا۔

عابدؔ پیشاوری نے ٹھیک ہی کہا تھا ''اب تو آنکھ بند کر کے تمہارے گھر پہنچ سکتا ہوں۔''

چند روز قبل انہوں نے یہی کیا۔ گھر کے سارے دروازے توڑ کر وہ انکھیں بند کیے کیے اس میں داخل ہو گئے اور بولے۔

''ان دوہوں کا کیا ہوا۔۔۔؟''

''کون سے دوہے؟'' مجھے کچھ یاد نہ تھا۔۔۔۔ پھر خواب ہی میں جیسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اور میری آنکھ کھل گئی۔

دماغ نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ کافی دیر بعد ان کی ''موجودگی'' کے سحر سے باہر نکل سکا، تو اپنے آپ سے عہد کیا کہ یہ دوہے ہر حال میں شائع ہوں گے اور یہ خاکہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ تیس پینتیس سال کے تعلّقات کی ساری ہی یادوں کو کُھرچا اور جو کچھ بھی برآمد ہوا اسے الفاظ میں منتقل کر دیا ہے۔

ظاہر ہے، تفصیلات میں کچھ اُلٹ پھیر ہوئی ہوگی، یادداشت نے جگہ جگہ دھوکا ضرور دیا ہوگا، لیکن بھابھی سے کچھ پوچھنے کی ہمّت نہیں۔

عابد پیشاوری شاعر تھے، اعلا پایہ کے نقّاد اور محقّق تھے، انشاء پر اُن کی کتابیں اور ''رانی کیتکی کی کہانی'' پر اُن کا مضمون اس کے ثبوت ہیں، اور ان سب سے بڑھ کر کھرے انسان اور بے حد پُرخلوص دوست۔

ادب اُن کے ساتھ کیا سلوک روا رکھے گا یہ وہ جانے لیکن ان لوگوں کی یادوں میں جو اُن سے دو چار بار بھی ملے ہیں، وہ زندہ رہیں گے۔ کاروبارِ زندگی سے فرصت کے لمحات میں یا ان کے دوران بھی جب بھی وہ یاد آئیں گے، دل کے کسی کونے میں ایک سرد لہر دوڑ جائے گی اور آنکھیں اشک بار چاہے نہ ہوں، اُن میں نمی کا احساس ضرور ہوگا۔

■ ■

وجاہت علی سندیلوی

وجاہت علی سندیلوی، زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا، اَسّی ابواب کی ایک ایسی کتاب کا نام ہے جس کا ہر باب روشن، ہر صفحہ حرکت وعمل کی تفسیر اور ہر لفظ علم وادب کی تعبیر ہے۔

اس نام کے تینوں الفاظ ایک حیرت انگیز کہانی کہتے ہیں۔۔۔سندیلوی مردم خیز سندیلہ سے متعلق ہے، لفظِ علی علم وادب، فہم وفراست اور جرأتِ اظہار بلکہ جرأتِ انکار کا اشاریہ ہے اور ''وجاہت'' ان کی شخصیت کے لیے نہیں تو ان ایسوں کی شخصیت کے لیے ہی جیسے زبان کا حصہ بنا تھا۔

وجاہت صاحب سے غائبانہ تعارف تو ان کی دو مزاحیہ تصانیف کے ذریعہ ہوا تھا لیکن خود ان سے ملاقات کب ہوئی ٹھیک سے یاد نہیں۔ خط وکتابت ۱۹۶۲ء کے آخر یا ۱۹۶۳ء کے شروع سے، جب ماہنامہ ''کتاب'' کا ڈول ڈالا تھا، تھی لیکن پہلی ملاقات میں جو ممکن ہے ان کے داماد کے پریس میں ہوئی ہو کہ ماہنامہ ''کتاب'' وہیں چھپتا تھا، مایوسی نہیں تو کسی قدر حیرت ضرور ہوئی تھی۔ اس قدر نستعلیق، کڑھی ہوئی اور سنجیدہ شخصیت، جس کی گفتگو میں خندۂ زیرِ لب کی گنجائش کا امکان بھی مشکل معلوم ہوتا تھا، اور مزاح نگار؟ لیکن جب ان دونوں کتابوں کے مضامین اور موضوعات کے برتنے کے انداز پر نظر گئی تو ان کے ثقافتی اور تہذیبی رچاؤ، علم وادب

کی آنچ اور نیم دیہی، نیم شہری اشرافیہ کی شرافت و متانت اور ماضی کی ''عظمتوں'' کو شعوری طور پر بھلانے کی کوششوں کے باوجود قول و فعل میں سنسکاروں کی دُھوپ چھاؤں کی آمیزش نے شخصیت اور طنز و مزاح کے بہ ظاہر تضاد کو یکسر کافور کر دیا۔

رابطہ کا آغاز، جیسا کہ ذکر آچکا ہے، ماہنامہ ''کتاب'' کے حوالے سے ہوا تھا اور نصف ملاقاتوں تک محدود تھا۔ خط بہت اچھا لکھتے تھے، تحریر کی شگفتگی بصری بھی ہوتی تھی اور معنوی بھی۔ خط و کتابت کا سلسلہ ۱۹۷۶ء میں رسالہ کی اشاعت ختم ہونے کے بعد منقطع ہو گیا اور یوں بھی کہ جب شخص سامنے ہو تو عکس کے پیچھے کون بھاگے۔ ۱۹۹۲ء میں وجاہت صاحب کی ایک غزل غالباً ماہنامہ ''کتاب نما'' میں شائع ہوئی تھی۔ کتابت کی غلطی نے ایک مصرع کو کچھ سے کچھ بنا دیا تھا لیکن عروض کے اعتبار سے درست تھا اور معنی بھی برآمد ہوتے تھے، کسی قدر مبہم سے۔ میں نے خط لکھا، ڈرتے ڈرتے، کہ شاعری سے رہ و رسم آشنائی ہے تو ضرور لیکن کچھ یوں ہی سی۔ ۲۶ / اگست کے اپنے خط میں انھوں نے لکھا۔

برادرم عزیز عابد سہیل صاحب! دُعائیں

صحیح شعر یوں ہے

درمیاں باقی نہ تھا الفاظ کا
میں اسے اور وہ مجھے دیکھا کیا

خیر طلب
وجاہت علی

یوں بھی ہو سکتا ہے

ہو چکے الفاظ سب بیکار تھے

....

ختم معنی ہو چکے الفاظ کے

....

کچھ نہ تھا کہنے کو اب باقی بچا

خط قلم برداشتہ لکھا گیا ہے۔ ایک مصرع کے بجائے تین تین مصرعے فی البدیہہ کہہ دینا فنِ شاعری پر ان کی قدرت کی دلیل ہے۔

یہ خط تو بہت بعد کا ہے۔ ان دنوں جب وجہ خط و کتابت ماہنامہ ''کتاب'' تھا، وجاہت صاحب نے سندیلہ آنے کی دعوت متعدد بار دی، خاص طور سے آموں کے موسم میں، لیکن ''سفر وسیلۂ ظفر'' کا قائل ہونے کے باوجود بے کار کے کاموں میں کچھ ایسا اُلجھا رہا کہ یہ سعادت حاصل نہ کر سکا۔

اُن دنوں جب ماہنامہ ''کتاب'' شائع ہوتا تھا، بیس پچیس خطوط تو میں نے لکھے ہی ہوں گے اور شاید اتنے ہی اُنہوں نے۔ میں غیر منظم قسم کا انسان ہوں اور اس دوران نقلِ مکانی بھی کرنی پڑی، چنانچہ بہت کچھ ضائع ہو گیا۔ تاہم جانے کیسے بہت بعد کا ایک خط، جس سے ان کی شخصیت، مزاج، تحریر میں طنز و مزاح کی چھینٹ اور زبان و بیان پر اُن کی گرفت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، محفوظ رہ گیا۔

یہ تحریر، جواب ہے غالباً اُس خط کا جس میں اُن سے انجمن ترقی پسند مصنّفین کی ریاستی کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے خطبہ پڑھنے کی میں نے درخواست کی تھی۔

4.2.87

برادرم عزیزم عابد سہیل صاحب۔ دعائیں

ابھی آپ کا محبت نامہ ملا اور فوراً جواب دے رہا ہوں۔ یقیناً آپ اُن چند محبوّں میں سے ہیں جن کی کوئی فرمائش ٹالنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ لیکن جو بات میرے حدّ امکان ہی میں نہ ہو اس کے لیے کیا کروں۔ آج ایک بارات میں گورکھپور جانا ہے اور ۷/ سے پہلے واپسی کی امید نہیں۔

عدالت کی مصروفیتوں کو گولی ماریے، اس میں صرف نقصانِ مایہ ہے۔ شادی

وغیرہ کو بھی بالائے طاق رکھیے کہ اس میں بس شماتت ہمسایہ ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ خطبۂ صدارت کے لیے کچھ مواد بھی چاہیے۔ کچھ تاریخی تسلسل بھی نبھانا ضروری ہے اور کچھ موجودہ کانفرنس کی شانِ نزول پر بھی روشنی پڑنا چاہیے، وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔ اور میں یہاں ایک ایسے جزیرہ کا باشندہ ہوں جہاں بڑے بڑے طوفانوں کی کوہ شکن موجیں بھی پاؤں میں پازیب باندھ کر آہستہ خرام بلکہ مخرام کے انداز میں پہنچتی ہیں۔ کتابیں موجود نہیں، فرشتوں سے تعلقات خراب، وحی کا کوئی امکان نہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ جتنی مرتبہ آپ نے فرمائش کی میں نے ہمیشہ معذرت کر لی۔ اب پھر دست بستہ کر رہا ہوں۔ بھائی یہ میرے بس کا روگ نہیں، اس وجہ سے نہیں کہ میں اسے اپنی تساہلی سے کرنا نہیں چاہتا بلکہ واقعی سندیلے میں اسے کر ہی نہیں سکتا۔ ع

شوق دل میں رقص کا اور پاؤں میں زنجیر ہے

خدا کے لیے یہ مصرع نہ پڑھ دیجیے گا۔ ع

رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

یہاں پاؤں میں زنجیر نہیں، بلکہ پاؤں ہی نہیں (پاؤں کا صحیح املا پانو ہے۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق غلط لکھا ہے۔)

راقم

وجاہت علی

طنز و مزاح کے میدان میں وجاہت صاحب کے اکتسابات اور غالب سے ان کے شغف سے واقف پہلے ہی سے تھا لیکن افسانہ نگاری سے ان کی دلچسپی کا اندازہ ہوا اس وقت ہوا جب اشاعت سے قبل ''جمیل ماموں'' پڑھنے کا موقعہ ملا۔ یہ غالباً ۱۹۷۳ء کی بات ہے۔ یہ افسانہ

شائع ہوا اور خوب خوب پسند کیا گیا۔ برسوں بعد مکتبۂ جامعہ نے ان کا افسانوی مجموعہ شائع کیا تو انہیں باقاعدہ افسانہ نگار بھی تسلیم کرلیا گیا۔ مرحوم کی شعری کاوشوں سے تعارف بہت بعد میں ہوا۔ یہاں یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ ان کی شاعری پر کبھی خاص کیا معمولی سی توجہ بھی نہ دی تھی کہ ایسی ٹوٹ کر چاہنے، دنیا کو بازیچۂ اطفال سمجھنے، اپنے آپ اور زمانہ سے مطمئن نظر آنے اور عدالتوں میں کامیابی کے جھنڈے گاڑنے والی شخصیت میں وہ درد اور کسک کہاں سے آئے گی جو اچھی شاعری کے لیے شاید ضروری ہے۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد ان کی کسی نہ کسی تخلیق تک فوری رسائی حاصل کرنے کے لیے رسائل کے صفحات پلٹنے شروع کیے تو پہلی ہی غزل نے جو ہاتھ لگی سارے خودساختہ مفروضوں کے پرزے اُڑا دیے۔ اس غزل کے تین اشعار یوں ہیں۔

دھارے میں وقت کے ہر واقعہ حباب
ایسا ہوا تو کیا، ویسا ہوا تو کیا
گم نام مرگیا، احسان سے بچا
مرنے کے بعد گر، چرچا ہوا تو کیا
آیا تو حرفِ حق، میری زبان پر
کہرام اس پہ گر، برپا ہوا تو کیا

اُن کی شخصیت کے بانکپن اور دُنیا کو دیکھنے اور برتنے کے انداز سے کچھ کچھ واقفیت تو پہلے سے تھی لیکن اُن کے شعری مجموعے ''پرواز'' کا مطالعہ کیا تو اِن اشعار نے شخصیت کی کچھ اور تہیں کھولیں۔

ہے حکم، شہرِ ستم میں نہ کیجیے فریاد
لگے جو تیغ تو قاتل کو مرحبا کہیے

....

ہر عبادت ثواب کی خاطر
شیخ یوں زندگی نہیں ہوتی

خاک ہوکر ہم عناصر میں نہاں ہو جائیں گے
آج تو محدود ہیں کل بیکراں ہو جائیں گے

اہلِ سندیلہ کے لیے لکھنؤ کی حیثیت، جہاں وجاہت صاحب نے ہائی اسکول کے بعد سے ایل۔ایل۔بی تک کی تعلیم حاصل کی، گھر آنگن کی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں کرسچین کالج کے طالب علم تھے اور اسی سال اس کالج سے بس دو تین سو قدم کے فاصلے پر رفاہِ عام کلب ہے جہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کا تاسیسی اجلاس ہوا تھا جس میں شرکت کرنے والوں میں ایسوں کی کمی نہ تھی جن کے علم و فضل کی خوشبو نے پورے ملک کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ وجاہت صاحب اس کانفرنس میں تو موجود نہ تھے لیکن فکر کے اس دھارے سے، جس کی ایک جہت یہ انجمن بھی تھی، رشتے استوار کرنے میں انہیں دیر نہ لگی اور ذہنی سطح پر یہ تعلق زندگی کی آخری سانس تک قائم رہا۔

انجمن اور اس کے افکار سے اس تعلق کی بنیاد جلسہ گاہ سے کرسچین کالج کی مکانی قربت کے بجائے فکر و نظر کی ہم آہنگی تھی کہ چند سال بعد قوم پرست مسلمانوں کا جو گروپ سرگرم عمل ہوا تھا اور جس کے سرخیلوں میں سردار جعفری، علی جواد زیدی، قاضی جلیل عباسی اور مجاز کے بڑے بھائی انصار ہروانی شامل تھے، اس میں کسی قدر جونیر ہونے کے باوجود، وجاہت علی سندیلوی خاصے نمایاں تھے۔ وہ اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے تاسیسی اجلاس کے سرگرم کارکن تھے اور آج شاید یہ بات ناقابلِ یقین معلوم ہو لیکن ہے حقیقت کہ محمد علی جناح نے اس اجلاس کا افتتاح کیا تھا اور پنڈت نہرو نے صدرات۔

ملک میں فرقہ پرستی کے بیج کو جڑ پکڑنے سے روکنے کے لیے ترقی پسند ادیبوں اور بائیں بازو کی تنظیموں سے متعلق طلبہ اور کمیونسٹوں نے جتنی قربانیاں دیں اور جن جن صعوبتوں سے گزرے، افسوس وقت کی کروٹ نے اس سب کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ہے، لیکن کامیابی

اور ناکامی سچائی کے پیمانے نہیں ہوتے۔ پیمانہ صرف یہ ہوتا ہے کہ کس نے عقیدہ کی کس پختگی اور کس جگر سوزی سے اس کے لیے کام کیا اور اسے کس حد تک اپنے مزاج اور شخصیت کا حصہ بنایا۔
۔۔۔اگرچہ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس سچ کو جو کبھی ان کے لیے حرزِ جاں تھا، بھنایا اور ترقی کا زینہ بنایا لیکن پورے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے، کہ وجاہت علی سندیلوی اُن میں نہ تھے۔

ہر داغ ''تھا'' اس دل میں بجز داغِ ملامت

یادش بخیر اس وقت کے زمین و آسمان آج کی ''بے زمینی اور ''بے آسمانی'' سے یکسر مختلف تھے ۔۔۔ سیاست میں، ادب میں اور زندگی کی ساری بساط میں ۔۔۔ سیاست خدمت اور اقدار کی پاسداری کا نام تھا، جان و دل عزیز رکھنے کا نہیں کہ قربانیاں اس کے جلو میں چلتی تھیں۔ یہی حال بیشتر شعبہ ہائے زندگی کا تھا۔

روشن خیالی اور ترقی پسندی، ظلم و ستم سے دُنیا کو آزاد کرانے اور اسے حسین سے حسین تر بنانے کے ایک خواب کا نام تھا جس سے نوجوانوں کے دل و دماغ معطّر تھے۔ کافرو دین دار کا وہ فرق نہ تھا جو آج سکّہ رائج الوقت ہے۔ دل و دماغ کی اس سرشاری اور کھلے پن میں وجاہت علی سندیلوی اپنے ان ساتھیوں کے ہمراہ جو عمر میں ان سے کسی قدر بڑے تھے، قدم سے قدم ملا کر چلتے رہے۔

اطلس و کمخواب کی پوشاکیں، کہ ان کے والدین رؤسائے سندیلہ میں تھے، ان کے جسم پر کھدّر کے کپڑوں کو رشک و حسد سے دیکھتیں اور اپنی بے قدری پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتیں چھٹیوں میں کالج سے سندیلہ جاتے تو ماں یہ قیمتی جوڑے نکال کر تخت پر سجا دیتیں کہ شاید ان پر نظر پڑ جائے اور وہ انہیں ایک بار بھی پہن لیں تو ان کا سلونا سوارت ہو جائے۔ لیکن وہ انہیں دیکھتے، مسکراتے اور کھدّر کا کرتا پاجامہ زیب تن کر لیتے۔

اسٹوڈینٹس فیڈریشن، انجمن ترقی پسند مصنّفین، ہفت روزہ ''ہندستان'' ماہنامہ ''نیا ادب'' انگریزی سہ ماہی ''نیو انڈین لٹریچر'' اور سہ ماہی ''منزل'' اور کمیونسٹ پارٹی اور کانگریس، خانے

الگ الگ تھے، اور کچھ ایسے الگ بھی نہیں، لیکن یہ سب مل کر ایک ایسے سالمے (Whole) کی تعمیر کرتے تھے جو قربانی اور سرشاری کا دوسرا نام بھی تھا۔ چنانچہ وجاہت علی سندیلوی اسٹوڈینٹس فیڈریشن میں سرگرم ہونے کے علاوہ کانگریس کی ریاستی کمیٹی کے اس شعبہ کے انچارج بھی تھے جو مسلمانوں سے رابطہ مضبوط کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس شعبے سے متعلق تھے ڈاکٹر زیڈ احمد، ڈاکٹر محمد اشرف اور بہت سے دوسرے ایسے ڈاکٹر جو مریضوں کے نبض شناس تو نہ تھے لیکن ان کی انگلیاں وقت کی نبض پر رہتی تھیں۔

وجاہت علی سندیلوی اس سے قبل لکھنؤ یونیورسٹی اسٹوڈینٹس یونین کے نائب صدر اور یونیورسٹی پارلیمنٹ کے وزیر داخلہ بھی رہ چکے تھے۔ ایل۔ ایل۔ بی کرنے کے بعد انہوں نے وکالت شروع کی، لیکن کچھ ہی دنوں بعد ''قومی آواز'' کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تو صرف نظریاتی ہم آہنگی۔ کے سبب وکالت ترک کر کے برائے نام مشاہرہ پر اس کے شعبۂ ادارت سے وابستہ ہو گئے۔

حافظؔ کی سرکشی، میرؔ کی شاعری کی کسک، غالبؔ کی خردمندی اور سوداؔ کے شہر آشوب کے مطالعہ کے جلو میں جو نسل پروان چڑھی تھی، وجاہت علی سندیلوی اسی سے متعلق تھے اور انہوں نے فیضؔ کے لفظوں میں

شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی
خیر سے زندگی تباہ نہ کی

کانگریس اور بائیں بازو کی فکر ونظر سے ان کے عملی تعلق کی بنیاد نظریاتی تھی اور ذہنی ہم آہنگی کی استواری کی انتہا یہ تھی کہ ۱۹۴۷ء میں جب مسلم لیگی راتوں رات کھدر کے کپڑے پہن کر کانگریسی بن گئے تھے، انہوں نے اپنی کھدر پوشی ترک نہ کی تھی۔ لیکن جب یہ موٹا جھوٹا لباس کوٹا پرمٹ حاصل کرنے کا پاسپورٹ بن گیا تو انھوں نے سُبک ہونے کے بجائے ''وفا کیسی کہاں کا عشق'' کی راہ اپنائی اور

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

کے مصداق اس کوچے کو دور سے سلامِ رخصت کیا جہاں سارے فیصلے حرم اور اہرام کی بنیاد پر ہونے لگے تھے۔

آزادی اپنے جلو میں قتل وخون کے علاوہ اُردو دشمنی کی ایک موجِ خوں بھی لائی۔ ایک دوسرے سندیلوی (شجاعت علی) نے کھدّر پوشی ترک کرنے کا سبب مجھ سے ان الفاظ میں بیان کیا تھا ”آزادی کے چند دن بعد جب میں نے جھنڈے والے پارک کے پختہ ڈائس پر سے اُردو کی عبارت کھرچتے ہوئے کانگریسیوں کو دیکھا تو پہلا کام یہ کیا کہ باقاعدہ کھدّر پوشی ترک کر دی“۔

لکھنؤ سے سندیلہ کتنی دور ہے، لیکن اُردو دشمنی کو یہ مختصر سا فاصلہ طے کرنے میں پانچ برس لگ گئے اور ۱۹۵۲ء میں جب اسکولوں سے اُردو خارج کی گئی تو وجاہت علی سندیلوی نے ڈسٹرکٹ بورڈ کی تعلیمی کمیٹی کی چیرمینی ہی نہیں، بورڈ تک سے استعفیٰ دے دیا۔ لیکن اگلے ہی سال عوام کے براہ راست ووٹوں نے انھیں نگر مہا پالیکا کی چیرمینی تک پہنچا دیا۔ اس انتخاب کی شان یہ تھی کہ کُل ووٹوں کے تین چوتھائی ان کی جھولی میں تھے اور باقی ایک چوتھائی تتھو، بدّھو اور خیراتی کے حصہ میں اور یہ تتھو، بدھو بڑی بڑی پارٹیوں کے حمایت یافتہ تھے اور بذات خود ایسے نہ تھے بلکہ عوام کے ووٹوں نے انہیں یہ ”مسند“ عطا کر دی تھی۔

اترپردیش اُردو اکادمی کے موجودہ اور سابق ممبروں کی تعداد اب سیکڑوں میں ضرور ہوگی لیکن وجاہت صاحب کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے اکادمی سے تعلّق کے دوران اُردو پڑھانے کا ایک ایسا قاعدہ تیار کیا جس کی دو لاکھ سے زائد کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔

وجاہت صاحب کے علمی اور ادبی اکتسابات میں جانے کا نہ یہ موقع ہے اور نہ مجھ میں صلاحیت، لیکن ان کی مزاح نگاری اور افسانہ نگاری کے ایک پہلو کا ذکر ضروری ہے۔ ہندستان میں وہ اُردو کے آخری مزاح نگار تھے جن کے یہاں زندہ کردار ملتے ہیں۔ زندہ کرداران کے

افسانوں میں بھی ملتے ہیں اور ''جمیل ماموں'' اس کی ایک روشن مثال ہے۔

اور غالب کے تو وہ عاشق تھے۔ دیوانِ غالب کا ہر خوبصورت ایڈیشن، چاہے وہ جہاں چھپا ہو، اس الماری کی زینت تھا جس میں ان کی منتخب کتابیں خوبصورتی سے سجی تھیں۔ ان کے علاوہ دیوانِ غالب کا ایک ایسا نسخہ بھی تھا جو کبھی تکیے کے نیچے رہتا اور کبھی سرہانے رکھی ہوئی میز پر۔ معلوم نہیں اُس کا مطالعہ انہوں نے کتنے سَو بار کیا ہوگا۔ غالب سے متعلق شاید ہی کوئی کتاب ہو جو ان کی نظر سے نہ گزری ہو۔ اور بھی بہت کچھ پڑھتے رہتے جس میں انگریزی کے علاوہ اُردو کے جاسوسی اور اچھے بُرے ناول بھی ہوتے، لیکن ہر دوسرے تیسرے دن دیوانِ غالب کا اپنا پسندیدہ نسخہ شروع سے آخر تک ضرور پڑھ ڈالتے۔

اپنی کتابیں مشکل ہی سے کسی کو عاریتاً دیتے اور کبھی ایسے ہی مجبور ہو جاتے تو اس وقت تک تقاضہ کرتے رہتے جب تک کتاب واپس نہ مل جاتی اور ان تقاضوں سے ان کی وہ بیٹی تک محفوظ نہ رہ پاتی جس کا اُوڑھنا بچھونا بھی کتابیں ہی ہیں۔ ایک ایک رسالہ کو، جسے وہ اپنے کام کا سمجھتے، محفوظ رکھنے میں خوش ذوقی کا ثبوت دیتے اور ان کی ترتیب میں معمولی سی تبدیلی سے بھی انہیں پتہ لگ جاتا کہ کسی نے ان کو ہاتھ لگایا ہے۔

پُر وقار اندازِ گفتگو اور سنجیدگی کے پہلو بہ پہلو مزاح کی ایک ہلکی سی موجِ تہہ نشیں بھی اُن کی شخصیت کا حصّہ تھی۔ ایک دن امین آباد میں کتابوں کی ایک دوکان پر گئے۔ دوکان میں کوئی نہ تھا۔ خریدار تو ظاہر ہے نہ تھے لیکن اس وقت نہ مالک موجود تھا، نہ معاون۔ کاونٹر پر چند روپے اور ریزگاری بکھری تھی، الماریوں میں کتابیں سجی تھیں۔ دس پانچ منٹ انتظار کیا، پھر ایک مختصر تحریر چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔

''اُردو کی بے قدری دیکھ کر افسوس ہوا۔ اب اس بدقسمت زبان کو چور بھی نہیں ملتے۔

وجاہت علی سندیلوی''

فلسفے سے مجھے تھوڑی سی دلچسپی ہے۔ وجاہت صاحب نے فلسفہ اس طرح تو نہیں

پڑھا تھا جیسے کلاسوں میں پڑھایا جاتا ہے، ہاں زندگی کے ان مسائل سے، جو اپنی بسیط اور کسی قدر ماورائی نوعیت کے سبب فلسفیانہ رنگ و آہنگ اختیار کر لیتے ہیں، انھیں گہری دلچسپی تھی اور ہماری گفتگو کبھی کبھی تجریدی (Abstract) تصوّرات کے آس پاس بھی پہنچ جاتی۔ ایک دن میں نے کہا "ہمارے تصوّرِ خدا سے بہتر کیا خدا کا کوئی تصوّر ممکن ہے؟"

ایک لمحہ کے توقف کے بغیر بولے۔ "ایسا خدا جو اپنی خوشامد سے خوش نہیں ہوتا، اس خدا سے بہتر ہے جو اپنی خوشامد سے خوش ہوتا ہے"

اُن کے جواب سے میرا سارا فلسفہ افلاطون کا Idea یا علم الحساب کا صفر بن کے رہ گیا۔

آخری بار لکھنؤ آئے تو ایک ایک کر کے اپنے سارے بزرگوں اور ہم عمروں سے ملنے گئے۔ خوردوں کو بھی نوازا۔ مجھ سے ملنے بھی تشریف لائے، یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں موجود نہ تھا۔

وجاہت صاحب بارِ خاطر کبھی نہ بنے، یار شاطر ہی رہے۔ چھتیس گھنٹوں کی مختصر علالت کے بعد جس میں وہ اپنے بیٹے، بیٹیوں اور دوسرے اعزا کو یہی یقین دلاتے رہے کہ معمولی سا زکام ہے، دو ایک دن میں ٹھیک ہو جاؤں گا، انہوں نے خاموشی سے آنکھیں موند لیں، ہمیشہ کے لیے۔

اُن کا آخری مجموعۂ کلام "پرواز" انتقال کے بعد شائع ہوا۔ اس مجموعہ کی آخری غزل کا آخری شعر دنیا اور زندگی کی جانب ان کے رویّہ کی ایک روشن مثال ہے۔

عرفانِ ہستی جب ہوا عالم نیا میرا بنا
دُنیا کو ٹھوکر مار کر میں چاند تاروں پر چلا

■ ■

منظر سلیم

دسمبر کی ساتویں رات، ظاہر ہے کہ سرد تھی اور جلد اتر بھی آئی تھی۔ منظر سلیم لیٹر پیڈ کا پیکٹ ہاتھ میں لیے ہوئے کتابوں کی ایک دُکان میں داخل ہوئے، جو شاعروں کی موجودگی کی وجہ سے بند ہونے کے وقت کی پابندی سے بے نیاز، اکثر رات گئے تک کھلی رہتی ہے۔ دوستوں کی صحبت میں کچھ دیر خوش کام ہوئے اور یکا یک اٹھ کھڑے ہوئے کہ سردی چمک اٹھی تھی اور پیکٹ ہاتھ میں لیے، سر جھکائے، دھیرے دھیرے اپنے مکان کی طرف جو بہ مشکل دو فرلانگ دُور تھا روانہ ہو گئے۔

ایک بار بھی پلٹ کے نہ دیکھا کہ اس کی ضرورت ہی نہ تھی اور انہوں ایسا کیا بھی ہو پاتا تو انہیں اندازہ نہ ہوتا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے۔

گھر پہنچے، لیٹر پیڈ کا پیکٹ میز پر رکھا، تھوڑی دیر بعد کھانا کھایا۔ کسی کو گمان بھی نہ تھا کہ موت ان کے ساتھ ساتھ گھر میں داخل ہو چکی ہے۔ بستر پر دراز ہونے کے چند منٹ بعد سینے میں درد اُٹھا۔ دونوں بیٹیاں، جو خود بھی ڈاکٹر ہیں، اپنے اپنے گھر تھیں۔ محلّے کے ایک ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ ماہرِ قلب بھی آئے۔ لیکن،

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

اور ذرا کی ذرا میں مجاز کے بعد شہر کی نئی نسل کی سب سے معتبر آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

منظر سلیم سے پہلی ملاقات کل کی بات معلوم ہوتی ہے، خاص طور سے یوں کہ بات چیت کے انداز، شکل وصورت اور مخالفوں کو بے دست پا کر دینے والی اُن کی مسکراہٹ میں سرِمو فرق نہ آیا تھا، بس جسم پر تھوڑا سا، بہت تھوڑا سا، گوشت چڑھ گیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اب بھی خود شناس اور مردم شناس تھے۔ علی شیر نوائی ایسا بین الاقوامی انعام ملنے کے بعد بھی دوستوں اور شناساؤں کی جانب ان کا رویّہ اور برتاؤ پہلے ہی جیسا تھا۔ انہیں دیکھ کر ڈاکٹروں کا یہ خیال کہ سن رسیدگی کے اثرات کو کچھ دنوں کے لیے ٹالا تو جا سکتا ہے لیکن اسے روکا نہیں جا سکتا، غلط معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اسے روکے رکھنے کا گُر بھی ڈھونڈھ نکالا تھا۔

ان سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی یہ تو یاد نہیں لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ ایک دن ''کتابی دُنیا'' میں ''ادبِ لطیف'' کے سرِورق پر چار تصویروں میں سب سے اوپر ایک نوجوان کی تصویر دیکھ کر میں دوسروں کی نظریں بچاتے ہوئے ان کے چہرے سے اس تصویر کا موازنہ کرنے کے بعد حیران رہ گیا تھا۔ تصویر ان ہی کی تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ نیچے کی تین تصویریں بزرگ شاعروں اور نثر نگاروں کی تھیں۔ حیرت اور مسرّت کے ملے جلے جذبے کے ساتھ میں بار بار ان کی صورت اور اس تصویر کا موازنہ کرتا رہا تھا۔

یہ بات غالباً ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء کی ہے۔ اس وقت شہر میں اُردو کے ادیبوں کے چار مرکز تھے۔ ایک تو یہی ''کتابی دُنیا''، دوسرا ''دانش محل'' جہاں عام طور سے بزرگ ادیب جمع ہوتے تھے، تیسرا مرکز انجمن ترقی پسند مصنّفین کے جلسے جو ہر ہفتے پابندی سے سرور صاحب کے بیرو روڈ کے مکان پر اور کبھی کبھی علیم صاحب کے یونیورسٹی ڈیلیگیسی سینٹر کے مکان پر ہوتے تھے۔ چوتھا مرکز تھا اُولڈ انڈیا کافی ہاؤس جہاں اُردو اور ہندی کے نوجوان ادیبوں کے علاوہ ڈی پی مکھرجی، ایم چلپتِ راؤ، رام منوہر لوہیا، آل احمد سرور، ڈاکٹر عبد العلیم اکثر و بیشتر اور احتشام صاحب اور امرت لال ناگر

وغیرہ کبھی کبھی آتے تھے۔ ان دنوں کے کافی ہاؤس کا آج کے کافی ہاؤس سے موازنہ نہ کیجیے۔ اس وقت وہاں چند بیرے ایسے بھی تھے جو نقوش، جاوید اور سویرا ایسے ادبی رسائل کے منتظر رہتے تھے اور گفتگو دھیمے لہجے میں ہوتی تھی، ایک میز کی آواز دوسری میز تک نہیں پہنچتی تھی۔

ناممکن تھا کہ ان ادبی مراکز میں مجاز، شوکت صدیقی، کمال احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد حسن، سلام مچھلی شہری، مجید پرویز، برج موہن ناتھ کاچر، منظر سلیم اور ''جہنم سے ایک خط'' ایسے افسانے کے خالق ایم۔شکیل میں سے کوئی نہ کوئی موجود نہ ہو۔ انجمن کے جلسوں میں تو ریاستی گورنر سروجنی نائڈو، آل انڈیا ریڈیو کے مشہور پروڈیوسر ایاز انصاری، مسعود حسن رضوی ادیب، اثر لکھنوی، علی عباس حسینی اور جگر مرادآبادی ایسے ادیب و شاعر تک کبھی کبھی شریک ہوتے تھے۔

نوجوانوں پر تو ان دنوں قیامت کا جنون طاری تھا، دُنیا کو بہتر بنانے کا، ملک کو خوشحالی سے ہم کنار کرنے کا، مفلسوں کے کاندھوں سے غربت اور ذلّت کا جوا اتار پھینکنے کا۔ آج ممکن ہے ساحل سے طوفان کا نظارہ کرنے والوں کو ان نوجوانوں کا یہ جنون پاگل پن معلوم ہو لیکن ان کے سامنے ایک مقدس مقصد ضرور تھا جسے حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اپنا سارا مستقبل اور زندگی تک داؤ پر لگا دی تھی۔ ان میں سے بیشتر آج کے معیاروں کے مطابق زندگی میں ناکام رہے لیکن انہوں نے کم سے کم ایک خواب تو دیکھا تھا، جب کہ بعد کی نسلوں کے نوجوان اس خواب سے بھی محروم رہ گئے۔ اس خواب کی تشکیل میں ادب کا بھی حصہ تھا جس کے تخلیق کاروں کی صفوں میں منظر سلیم کا نام اس وقت بھی نُمایاں تھا۔

ایک دن ''کتابی دُنیا'' میں ایک کتاب پر نظر پڑی۔ نام تھا ''بہترین نظمیں'' اور مرتّب تھے، میراجی اور قیوم نظر۔ صفحات اُلٹ پلٹ رہا تھا کہ منظر سلیم کی نظم پر نظر پڑی۔ اب اس نظم کا عنوان تو یاد نہیں لیکن تعارف کے صفحے پر تصویر کے بجائے میراجی کا شعر ضرور یاد ہے۔

اُن کے خط لکھنؤ سے آتے ہیں
اور کیا حال ہے خدا جانے

کئی دنوں بعد ایک دن ''کتابی دُنیا'' میں ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے کتاب ان کی جانب بڑھادی۔ ہلکی سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر پھیل گئی لیکن کچھ بولے نہیں۔ اس وقت تک ان سے خاصی جان پہچان ہو چکی تھی لیکن انہوں نے اس شعری انتخاب کا، جو اس وقت شائع ہوا تھا جب وہ انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے، کبھی ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ ایک دن کسی کام سے ''قومی آواز'' جانا ہوا، شاید پہلی بار، تو حیران رہ گیا کہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کے جلسوں میں شرکت کرنے والے متعدد ادیب وہاں موجود تھے۔ مکین احسن کلیم، حبیب صاحب، مسیح الحسن رضوی صاحب اور منظرؔ سلیم۔ ''قومی آواز'' اُس وقت اُردو کا سب سے بڑا اور سب سے اچّھا اخبار تھا جس کے مطالعہ کے لیے مولانا آزاد تک اپنی وزارتی مصروفیتوں سے وقت نکال لیتے تھے، اور کبھی کبھی زبان و بیان کی کسی غلطی پر خط بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ منظر سلیم کو یہاں دیکھ کر کچھ حیرت بھی ہوئی کہ عجیب بے نیاز شخص ہے، اپنے بارے میں کبھی بات ہی نہیں کرتا۔

سلامؔ مچھلی شہری، جو، ان دنوں ادبی رسالوں و جرائد میں ادیبوں کے نام منظوم خطوط لکھا کرتے تھے، ایک دن کافی ہاؤس آئے، تو مجاز سے بولے۔

''نقوش میں اپنا طویل خط دیکھ لوں تو چین سے مرسکوں گا۔'' یہ کہنے کے بعد ان پر کھانسی کا دورہ پڑا کہ ان دنوں ان کی صحت خاصی خراب تھی۔ مجازؔ تو شہرت اور مقبولیت کی بلندی پر تھے اور ان کے اشعار ہر ایک کی زبان پر لیکن یہ منظرؔ سلیم بھی عجیب شخص تھا۔ شاہراہ، مندر، ساقی، اَدبِ لطیف، ہمایوں، سویرا۔۔۔ اور اس کے بعد باقی ہی کیا بچتا تھا۔۔۔۔ میں اُس کی تخلیقات آن بان سے شائع ہوتیں، لیکن نہ کبھی ان کا ذکر کرتا نہ پرچہ بغل میں دبائے گھومتا۔ کتابوں کی رسمِ اجرا اور جشن نما جلسوں کا تو ان دنوں رواج ہی نہ تھا۔ ادیبوں کے دو ہی مشاغل تھے، پڑھنا اور لکھنا۔ پڑھنا زیادہ اور لکھنا کم، لیکن منظرؔ سلیم نہ کبھی کسی کتاب کا ذکر کرتے نہ اپنی کسی نظم کا۔ انجمن کے جلسوں میں نظم یا غزل سناتے تو شرماتے شرماتے، کچھ ایسی بے تعلّقی سے جیسے کسی

دوسرے کا کلام سنا رہے ہوں۔ کچھ کچھ فیضؔ کی طرح۔

یہ وہ زمانہ تھا جب باقرؔ مہدی جنہیں پروفیسر ڈی۔ پی۔ مکھرجی بے حد عزیز رکھتے تھے ''نو واردانِ بساطِ ہوائے دل'' سے پوچھا کرتے تھے کہ فلاں کتاب پڑھی؟ نہیں پڑھی ہے تو اب پڑھ ڈالو، نہیں تو جاہل کہلاؤ گے۔ انہوں نے مجھے 'بالزاک' پڑھنے کا حکم دیا اور میں ڈرال اسٹوریز (Droll Stories) خرید لایا اور ان کے مطالعہ کے بعد جب حبیب اللہ ہاسٹل کے ان کے کمرے میں گیا تو محسوس کر رہا تھا کہ ساری نہیں تو آدھی دنیا ضرور فتح کر لی ہے۔ ان کے دریافت کرنے پر میں نے کتاب کا نام لیا تو انہوں نے خشمگیں نظروں سے دیکھا اور ان کے اسی انداز کے طفیل میں نے تفصیلات کو فن کا اعتبار بخشنے والے اس ناول نگار کے متعدد ناول پڑھ ڈالے۔ ان دنوں باقرؔ مہدی، منور آغا مجنوںؔ کی وہ رباعی اکثر سناتے تھے جس کا آخری مصرع ہے ''یہ شخص چلا جائے تو کھانا کھاؤں'' اور ولیؔ دکنی کا یہ شعر بھی۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

اسی مفلسی کے پروردہ ایک خودرو پودے کا نام منظرؔ سلیم بھی تھا۔ لیکن کسی نے انہیں نہ خود کو سبک کرتے دیکھا، نہ اپنی کسی پریشانی کا ذکر کرتے۔ بے رُخی کے بغیر لیے دیے رہنا اور زبان و دہن بگاڑے اور دوسروں کو خفیف کیے بغیر اپنی بات پر مصر رہنا انھیں خوب آتا تھا۔ ان کے کردار میں فولاد کی سختی تھی لیکن اس کا احساس کرنا بھی مشکل تھا کیوں کہ وہ نرم گفتاری کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔

کچھ تو نو آزمودہ کار کی جرأت اور کچھ بڑے ادیبوں مثلاً سلام مچھلی شہری، کمالؔ احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد حسن اور شوکت صدیقی سے قربت کے احساس سے پیدا ہونے والی ''خودسری'' کے تحت ایک دن ''کتابی دُنیا'' میں منظرؔ سلیم سے (جنہیں میں ہمیشہ منظرؔ بھائی کہتا تھا) دورانِ گفتگو ایک ایسا فقرہ میری زبان سے نکل گیا جو بے حد نامناسب تھا۔ وہ خاموش

ہو گئے، نا گواری کا اظہار تک نہ کیا۔ لیکن مجھے اپنی غلطی کا فوراً احساس ہو گیا اور میں نے اس کی تلافی کی کوشش بھی کی مگر برف کی ایک سل نہ سہی، چھوٹا سا ٹکڑا ضرور ہم دنوں کے درمیان فضا میں معلق ہو گیا۔ کئی دنوں بعد، ایک دن بغیر کسی اطلاع کے وہ میرے چھوٹے سے کمرے میں آموجود ہوئے۔ بانس کی ایک چھوٹی سی الماری میں رکھی ہوئی بیس پچیس کتابوں میں سے ایک ایک کتاب اُنہوں نے اُلٹ پلٹ کے دیکھی۔ زندگی، ادب، سیاست اور دُنیا جہاں کی باتیں کرتے رہے اور رُخصت ہوتے وقت ایک کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

''اسے پڑھنے کے لیے لے جاؤں''

میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہو سکتی تھی۔ میں مرتضیٰ حسین روڈ کے اس بڑے سے مکان کے باہری پھاٹک بلکہ کچھ دُور تک انہیں رُخصت کرنے گیا اور یکا یک میں نے محسوس کیا کہ برف کا وہ ٹکڑا جو میری غلطی کے سبب ہمارے درمیان معلق ہو گیا تھا، پگھل کر غائب ہو چکا ہے۔ اپنے چھوٹوں کی دلداری کا یہ انداز منظر بھائی ہی سے سیکھا جا سکتا تھا۔

یونیورسٹی میں ''قومی آواز'' کے اعزازی نامہ نگار کے طور پر میرے تقرر میں تو منظر سلیم کا براہ راست ہاتھ نہیں تھا لیکن وہ ماحول پیدا کرنے میں ضرور ان کا ہاتھ رہا ہوگا جس میں میری درخواست فوری طور پر منظور کر لی گئی۔ ان دنوں یونیورسٹی علم و ادب کے علاوہ اصولی و نظریاتی سیاست کی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ سیاسی محاذ پر چندر جیت یادو، ایس۔ این۔ ترپاٹھی اور را بن مترا، کرشنا نند، خدیجہ انصاری، انردھ گپتا، جواہر اور میرے ہم عمر اور مجھ سے عمر میں کچھ چھوٹوں میں عبدالمنان، ابن حسن، حیدر عبّاس رضا اور اکھلا نند وغیرہ سرگرم تھے۔ میرے سیاسی نظریات اور سرگرمیوں سے حیات اللہ انصاری صاحب بھی واقف تھے اور عشرت علی صدیقی صاحب بھی لیکن یہ ''قومی آواز'' کی فراخ دلی تھی کہ کانگریسی اخبار ہونے کے باوجود میری لائی ہوئی خبریں جو زیادہ تر اسٹوڈینٹس فیڈریشن سے متعلق ہوتی تھیں، کہ یونیورسٹی میں طلباء کی ہر تحریک کا مرکز یہی تنظیم تھی، پوری کی پوری شائع ہوتیں۔ مجھے فخر ہے کہ

میں نے صحافت کے اسرار و رموز مسیح الحسن رضوی، محمد حسن قدوائی اور منظر سلیم سے سیکھے، پہلے یونیورسٹی کے رپورٹر کی حیثیت سے اور بعد میں ''قومی آواز'' کے شعبۂ ادارت کے جونیئر ترین رکن کی صورت میں۔

ایک دن جھاؤلال کے پل پر اُن سے ملاقات ہوئی وہ امین آباد جا رہے تھے۔ اور میں امین آباد سے کرسچین کالج کی طرف۔ غالباً دونوں ہی سائیکل پر تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں ہی اپنی اپنی سائیکلوں سے اتر پڑے۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا۔

''قومی آواز میں ملازمت کیجئے گا۔؟'' مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ ان کا جملہ لفظ بہ لفظ اسی طرح تھا۔

''مجھے ''قومی آواز'' میں نوکری مل جائے گی۔۔۔؟'' میں نے بے یقینی کے انداز میں پوچھا۔

''آپ کو نہیں ملے گی تو پھر کسے ملے گی!'' انہوں نے جواب دیا۔

اس طرح میں ''قومی آواز'' سے باقاعدہ طور سے متعلق ہو گیا۔ ان دنوں مقامی اور اضلاع کے نمائندوں کی خبروں کے علاوہ ساری خبریں انگریزی میں آتی تھیں۔ ترجمہ کرنا محمد حسن قدوائی اور منظر سلیم نے سکھایا اور سرخی لگانا مسیح الحسن رضوی صاحب نے۔ مسیح الحسن اور قدوائی صاحب خبر، اس کی پیش کش اور ترجمے پر حاوی ہو جانے کے حق میں تھے اور حبیب صاحب اور منظر سلیم طالب علمانہ رویّے کے موئد۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ایسے صحافیوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا موقع ملا جو اُردو صحافت کی آبرو تھے۔ ''قومی آواز'' کے انتظامی امور دیکھنے کے علاوہ عشرت علی صدیقی صاحب ''دُنیا کا حال'' لکھتے اور اکثر اداریے بھی۔ ظاہر ہے کہ ان کاموں سے میرا کوئی تعلق نہ تھا، لیکن میں نے صحافت کے ان دیوزادوں کو کام کرتے ہوئے دیکھا ضرور ہے۔ یہ سعادت بھی کچھ کم نہیں۔

ترجمے کے سلسلے میں ایک واقعہ خوب اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے ایک خبر کا ترجمہ کیا، سرخی لگائی اور منظر سلیم کو، جو اس وقت شِفٹ انچارج تھے، دے دیا۔ انہوں نے ترجمہ پڑھا اور

اپنی اس مسکراہٹ کے ساتھ جو اُن ہی سے مخصوص تھی، بولے۔
''بات بنی نہیں''۔ اور خود ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ دو تین پیراگرافوں کا ترجمہ کرنے کے بعد بولے۔ ''اب بھی بات نہیں بنی''۔۔۔۔ اور کاغذ پھاڑ کے پھینک دیا۔ دوبارہ ترجمہ کرنا شروع کیا اور مکمل کرنے کے بعد میری طرف بڑھا دیا۔ بے حد عمدہ تھا۔ مجھ سے کاغذ لے کر میری دی ہوئی سرخی اس ترجمہ پر پن کر دی۔

اگلے دن حیات اللہ صاحب نے ترجمہ اور سرخی پر توصیفی نوٹ بھیجا، منظر صاحب نے مجھے مبارک باد دی اور اپنی محنت کی داد میری جھولی میں ڈال دی۔ ان کی اس ادا کی تفصیلات میں جاؤں تو ایک بڑے نام کی شخصیت مجروح ہو جائے گی، اس لیے ان ناولوں کا نام نہ لینا ہی بہتر ہے جن کے ترجمے کیے تو انہوں نے تھے لیکن چھپے وہ کسی اور کے نام سے۔

چند برس بعد منظؔر سلیم روس چلے گئے۔

تحفے تحائف محبتوں کو استواری بخشتے ہیں۔ جب بھی روس سے آتے میرے لیے کبھی ٹائی، کبھی سگریٹ اور کبھی سگار لاتے۔ روس میں ان کے قیام کے پندرہ بیس برسوں میں خط و کتابت کچھ ایسی زیادہ تو نہیں رہی، لیکن سال میں ایک آدھ خط آ ہی جاتا۔ میں قلم کا چور ہوں اس لیے قندِ مکرّر کا لطف بھی میرے ہی حصے میں آتا۔ اسی دوران علیم صاحب کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے خبر ریڈیو ماسکو سے سنی اور مجھے ایک طویل تعزیتی خط لکھا۔ خط کیا، ایک مرثیہ تھا۔ لوگ زندگی میں کامرانیاں حاصل کرنے کے بعد ان سیڑھیوں کو بھول جاتے ہیں، بلکہ گرا دیتے ہیں، جن کے سہارے وہ بلندیوں تک پہنچتے ہیں۔ لیکن منظؔر سلیم نہ اپنی مفلسی کے دنوں کو بھولے تھے نہ ان لوگوں کو جنہوں ان کے ذہنی اور علمی افق کو روشن کیا تھا۔

اُن کا پہلا ناول ''آغوش'' شائع ہوا اور کسی طرح عصمؔت چغتائی تک پہنچا تو ''کتابی دُنیا'' کے مالک اظہر نگرامی کو، جو اس کے ناشر بھی تھے، انہوں نے ناول کی تعریف میں خط لکھا اور منظر

صاحب کا پتہ مانگا۔ لیکن ان کے بعد کے کسی ناول کے گرد پوش پر عصمت چغتائی یا کسی دوسرے مصنف کی توصیفی رائے کی اشاعت مجھے یاد نہیں۔ وہ بیساکھیوں کے قائل نہ تھے۔

ان کے ناولوں کے کردار اور واقعات ایک دوسرے میں اور دونوں وقت میں اس طرح پیوست ہیں کہ ان کو الگ کرنا مشکل ہے۔ میں نے وقت، واقعہ اور کرداروں کے درمیان تعلّق کے بارے میں ایک بار پوچھا تو انہوں نے کہا ''ہر واقعہ، ہر کردار وقت اور حالات کا اسیر ہوتا ہے، مصنّف کا نہیں۔ جہاں آپ نے کردار کو اپنی مرضی کا اسیر بنانے کی کوشش کی، وہیں اس کی شخصیت مجروح ہوئی۔'' (ٹھیک ٹھیک یاد نہیں لیکن شاید ایسا ہی کچھ کہا تھا)

یہی داخلی نظم ان کی نظموں اور حد یہ ہے کہ غزلوں میں بھی ملتا ہے۔ انتشار سے احتراز، ایک ہی موڈ کی جاری وساری کیفیت اور زندگی سے قربت منظر سلیمؒ کی تخلیقات کی پہچان ہیں۔

روس سے واپسی کے بعد انہوں نے خود کو پھر سے مجتمع کیا تھا، ایک طویل ناول کا ڈول ڈالا تھا اور اپنی نظموں اور غزلوں سے ایک کہکشاں بکھیر دی تھی۔ ملک کا کون سا ادبی جریدہ تھا جس نے ان کی تخلیقات نہایت نمایاں طور سے شائع نہ کی ہوں۔ شعری مجموعہ بھی ترتیب دے رہے تھے، لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

مرحوم کی آخری چند غزلوں میں سے ایک غزل کے دو تین شعر سنیے اور سر دُھنیے۔

ذہن میں رُکنے نہیں پاتے خیال
جسم کے اوپر قبا ٹھہرے گی کیا؟

تیرگی نے مسخ کردیں صورتیں
آنے والی روشنی دیکھے گی کیا ؟

دھوپ ایسی ہے کہ دریا سوکھ جائیں
خون کے چھینٹوں سے رُت بدلے گی کیا ؟

احمد جمال پاشا

احمد جمال پاشا کے لیے لکھنا ایسا ہی تھا جیسے ہمارے آپ کے لیے سانس لینا۔ کچھ نہیں تو خط ہی لکھ رہے ہیں۔ یار دوست غپ بازی میں مصروف ہیں لیکن وہ گردن جھکائے لکھے جا رہے ہیں۔ کوئی ایک آدھ جملہ اُن کی طرف اُچھال دیتا ہے تو اس کا جواب بھی دے دیتے ہیں، جواب نہیں سوجھتا تو خاموش رہتے ہیں، اگرچہ ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ لیکن لکھنا برابر جاری رہتا ہے۔

جمال کی ساری ادبی زندگی کا نچوڑ ایک جملہ میں پیش کرنا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک لکھتے رہنا ہی کامیابی کی کنجی ہے۔ اس کنجی کا راز جمال کو ان دوستوں سے ہاتھ لگا تھا جو اسے اپنی تجوری میں مقفل کر کے بھول گئے تھے اور دوسروں کے کاموں میں کیڑے ڈالنے میں لگے رہتے تھے۔

جمال کی مزاح نگاری کا آغاز مذاق میں ہوا۔ ۱۹۵۳ء یا ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔ یونیورسٹی میں سالانہ ہڑتال چل رہی ہے۔ اس سال اس میں جوش و خروش، غم و غصہ اور طلبہ کی عام حمایت کا مسالہ زیادہ شامل ہے۔ تین طلبہ یونین بلڈنگ میں بھوک ہڑتال پر ہیں اور خطرہ

ہر وقت منڈلا رہا ہے کہ پولیس کی ٹکڑیاں جو سڑک کی دوسری جانب ذرا سے فاصلے پر، اُس وقت کے ''منکی برج''[۱] کی اوٹ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں، کسی وقت بھی چھاپہ مار کر بھوک ہڑتالی طلبہ کو میڈیکل کالج منتقل کر سکتی ہیں۔ یونین بلڈنگ کے سامنے کی سڑک پر جو اس وقت تقریباً میدان کی طرح تھی، دریاں بچھی ہیں، جن پر سیکڑوں طلبہ بیٹھے ہیں، بھوک ہڑتالیوں کی حفاظت کے لیے۔ یہ سلسلہ دو دن سے جاری ہے۔ لیکن نہ ''معتبر'' ذرائع سے حاصل ہونے والی خبروں کا تانتا ٹوٹتا ہے، نہ پولیس چھاپہ مار کر بھوک ہڑتالیوں کی دِلی مُراد برلاتی ہے کہ کچھ پیٹ میں تو جائے۔

رات بھیگ چکی ہے، اکتوبر یا نومبر کا مہینہ ہے اور گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ پولیس کے چھاپے کی صورت میں مقابلہ کیا جائے یا صرف پُر جوش و پُر شور احتجاج۔ بحث میں شامل طلبہ میں کچھ کمیونسٹ ہیں کچھ سوشلسٹ، کچھ کانگریسی ہیں کچھ ونوبا بھاوے کے مقلّد، کچھ انقلاب پسند رومانی، کچھ رومان پسند انقلابی، کچھ ایسے جو مسئلہ کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور کچھ ایسے جو اسے نظریہ کی چوکھٹ میں سجاتے ہیں۔ جب بحث میں گرمی کا عنصر دلیل سے زیادہ ہو گیا، بھویں تن گئیں، آستینیں چڑھالی گئیں، مونہہ سے جھاگ نکلنے لگے تو جمال ٹپ سے بولے۔

''بھائی میں تو عدم تشدّد کا قائل ہوں۔ بھولو پان والے کا قرض بہت بڑھ گیا ہے۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے گھور کر دیکھتا ہے تو جان ہی نکل جاتی ہے''۔

ان کے اس جملے نے ساری بحث ختم کر دی۔ جمال کے تین دوستوں میں سے جو وہاں موجود تھے، عبدالحلیم اور مرزا پھویا (غضنفر صدیقی) تو خاموش رہے، لیکن عابد سہیل نے سینئر ادیبوں کی طرح مربّیانہ انداز اختیار کرتے ہوئے جمال کو مشورہ دیا۔

''جمال تم مزاحیے کیوں نہیں لکھتے، تم میں تو بلا کی صلاحیت ہے''

---

[۱] اس وقت کا پُل ''منکی برج'' کہلاتا تھا اور موجودہ ہوٹل کلارک کے آس پاس تھا۔ ''ہنومان سیتو'' ۱۹۶۶ء یا ایک آدھ سال آگے پیچھے تعمیر ہوا۔

''مزاحیہ کیا؟'' جمال پوچھتے ہیں۔

''مزاحیہ۔۔۔یعنی۔۔۔'' عابد سہیل گڑبڑا جاتے ہیں۔۔۔ ''ارے یہی مزاحیہ مضامین''

معلوم نہیں اُس وقت جمال کی سمجھ میں آیا کہ نہیں کہ مزاحیہ کیا ہوتا ہے لیکن اگلے روز جمال قاضی باغ میں ''اختر منزل'' آئے، شرمائے شرمائے، لجائے لجائے، تو انہوں نے سگریٹ کی ڈبیا کے ساتھ جیب سے چار پانچ مڑے تڑے کاغذ نکالے۔

یہ جمال کا پہلا مزاحیہ تھا۔

لیجیے، جمال نے مزاحیے لکھنے شروع کر دیے۔ وہی جمال جو دوستوں کی خاطر چھرا نکال لیتا ہے، حلیم خاں کو ذلیل کرنے کی والد کی کوشش کے بعد بطور احتجاج جس نے خودکشی کرنے کی کوشش کی، چند روپے ہاتھ آتے ہی جو دوستوں کے گھر جا کر کہتا ہے۔۔۔ ''یار کہیں چلو، روپے کاٹ رہے ہیں''، دیکھتے ہی دیکھتے اَدیب بن گیا۔ لیکن ادیبوں کی ایک ادا بھی تو اسے نہیں آئی ۔۔۔ نہ چہرے پر سنجیدگی کی مصنوعی چادر، نہ گفتگو میں تصنع، نہ بڑے بڑے ادیبوں کے اُلٹے سیدھے حوالے، نہ فلسفہ، نہ حکمت، نہ فرد کی تنہائی، نہ تنہائی کا فرد۔ لیکن یہ سب کچھ چاہے اسے نہ آیا ہو، مزاح نگار ہے وہ چوکھا۔

میں جمال کو عظیم مزاح نگار نہیں مانتا، کوئی نہیں مانتا۔ لیکن اس کی ایک عظمت کا ذکر ضرور کروں گا۔ جمال اپنا مزاحیہ کسی دوست کو سنائیں یا کسی ادبی نشست میں پڑھیں اور کوئی کہے کہ یہ جملہ یوں نہیں یوں ہونا چاہیے تو معنی خیز انداز میں سر ہلائیں گے اور جیب سے قلم نکال کر جملہ اُسی وقت درست کر لیں گے۔

عابد سہیل نے اس قلب ماہیت کی اطلاع حلیم خاں کو دی، حلیم نے اقبال مجید کو، اقبال مجید نے قمر رئیس کو، قمر رئیس نے ڈاکٹر محمد حسن کو اور ڈاکٹر محمد حسن نے مجاز کو، جنھوں نے ان کا پہلا مزاحیہ ''سگریٹ پینا'' سن کر حضرت گنج میں یونیورسل بک ڈپو کے سامنے والے فٹ پاتھ پر پان کی دُکان کے سامنے ''بھئی خوب لکھتے ہو، خوب لکھتے ہو'' کہا تو جمال باقاعدہ مزاح نگار بن گئے۔

اُن دنوں لکھنؤ یونیورسٹی میں دوستوں کا ایک مثلث تھا، عبدالحلیم خاں، عابد سہیل اور احمد جمال پاشا۔۔۔ حلیم جنہوں نے تاریخ کے موضوعات پر چند بہت عمدہ مضامین لکھے تھے، عابد سہیل جنہوں نے اپنا افسانہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کے جلسہ میں پڑھا تھا تو باقر مہدی نے جو اپنے مزاج کی سیماب صفتی اور صاف گوئی کے لیے مشہور تھے، کہا تھا ''صرف موضوع کی اہمیت کی خاطر نصف گھنٹہ ضائع کیا'' اور احمد جمال پاشا تو خیر احمد جمال پاشا تھے ہی۔ پھر اس مثلث میں سے کوئی دُمدار ستارہ کی طرح ٹوٹ کر الگ ہوتا تو اس میں باری باری اقبال مجید، قمر رئیس، قاضی عبدالستار، حسن عابد اور آغا سہیل ایک ایک کر کے شامل ہوتے رہتے، لیکن رہتا یہ بہر حال مثلث ہی۔ عابد سہیل، جمال اور حلیم کے بعد اس نے اقبال مجید، جمال اور قمر رئیس کی شکل اختیار کی۔ اس کے بعد جمال، اقبال مجید اور غضنفر، پھر جمال، عابد سہیل اور حسن عابد۔ غرض لوگ بچھڑتے ملتے اور جُدا ہوتے رہے لیکن اس میں جمال کی وہی حیثیت رہی جو علم الحساب میں ایل۔ سی۔ ایم (L.C.M) کی ہوتی ہے۔

یہ گروپ درجنوں بار بگڑا اور بنا لیکن تین دوسری چیزیں اپنی جگہ قائم رہیں، اقبال مجید اور رتن سنگھ کی افسانہ نگاری جنہوں نے بالترتیب ''عدّو چچا'' اور ''ہادی'' لکھ کر اپنی دھاک جما دی تھی اور جمال کی مزاح نگاری۔ اس مثلث میں جمال، عابد سہیل اور اور حلیم خان کی اقلیدسی شکل کو بہر حال خاصی پائدار حیثیت حاصل تھی اور ٹوٹنے، بکھرنے کے بعد اس کے یہ تینوں زاویے جانے کیسے پھر یکجا ہو جاتے تھے۔

انہی دنوں اس مثلث کو ایک زبردست ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یونیورسٹی میں چند طلبہ سے ان کی کہا سُنی ہو گئی اور ان میں سے کسی کی ہمّت بھی نہ پڑی کہ مخالف گروپ سے ''سمجھ لیں گے'' تک کہہ پاتا۔ اس دن ان تینوں پر صحت کی اہمیت آشکارا ہوئی اور انہوں نے کسرت شروع کرنے کا ایک باقاعدہ پروگرام بنا ڈالا۔ فیس جس کا انتظام حلیم خان نے کیا تھا، جمع کر کے ایک جیم میں داخلہ لے لیا گیا، اور طے پایا کہ حلیم جو مولوی گنج میں رہتے تھے صبح صبح اُٹھ کر یحییٰ گنج

سے عابد سہیل کو لیں گے، پھر یہ دونوں امین آباد کے ''نہ گھر میرا نہ گھر تیرا'' والے ''رین بسیرا''
نامی مکان سے جمال کو اور پھر کچّے حاطے والے جیم میں، جس کے روحِ رواں اکھن نامی ایک
نہایت خوبصورت اور وجیہ نو جوان تھے، کسرت کی جائے گی۔ چند روز بعد اس پروگرام میں ایک
مد کا اضافہ ہو گیا۔ کسرت کرنے کے بعد یہ تینوں نظیر آباد جاتے اور تاج ریسٹورنٹ کی مشہور پوری
ترکاری کھاتے اور اس کے بعد لب دوز، لب سوز اور بقول کسے ''لب دھڑ'' چائے پیتے۔ پندرہ
بیس دن بعد کسرت کا سلسلہ تو ختم ہو گیا لیکن تاج ریسٹورنٹ کا پروگرام مہینوں چلتا رہا۔

ان دنوں جب کسی پان یا ہوٹل والے کا بہت زیادہ قرض چڑھ جاتا تو وہ سڑک جس پر
یہ دکان ہوتی ہم لوگوں کے لیے بند ہو جاتی۔ اور اسے ''بند سڑک'' کے نام سے یاد کیا جانے لگتا۔
عابد سہیل کو یحییٰ گنج سے یونیورسٹی جانے کے لیے راجہ بازار کی پیچ در پیچ گلیوں کا سہارا لینا پڑتا
اور جمال کے اپنے گھر سے نظیر آباد پہنچنے کے لیے تین راستوں میں سے دو بند ہیں لیکن ان
کو معلوم نہیں کیا ضد ہے وہ ادبدا کے وہی راستے اختیار کرتے ہیں جو بند ہوں۔ ان میں سے
ایک سڑک پر اس پان والے کی دوکان ہے جو جمال کے دوستوں کو دیکھتے ہی مونچھوں پر تاؤ
دینے لگتا ہے لیکن جمال کی شخصیت میں معلوم نہیں کیا سحر ہے کہ ان کے سامنے بھیگی بلّی بن جاتا
ہے اور چار مینار کی ڈبیا مانگے بغیر ان کے حوالہ کر دیتا ہے۔ حلیم کی حیثیت ''مشکل کشا' قسم کی
ہے۔ قرض کی رقم بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے تو پانچ دس روپے دے کر قرض خواہوں کی زبان بند
کر دیتے ہیں اور جمال ہوں یا عابد سہیل دوبارہ شیر بن جاتے ہیں۔

دوستوں کی لڑائیاں بھی دوستی کی توسیع ہی ہوتی ہیں۔ حلیم اور جمال کے درمیان سخت
قسم کی لڑائی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے، لیکن عابد سہیل کے سبب، جن کا خود بھی اس لڑائی میں تھوڑا
بہت ہاتھ ہے، یہ ڈور ابھی ٹوٹی نہیں ہے۔ انہوں نے جمال پر ایک طویل نظم لکھ کر حلیم کے
حوالے کر دی ہے اور حلیم ٹیگور لائبریری کے سامنے والے لان کے اس کونے میں جو گرنانی کے
ہوٹل کے پاس ہے، ایک درخت کے نیچے پتھر کی لمبی سی بنچ پر بیٹھے ہوئے یہ نظم مشترک دوستوں

کو سناتے ہیں۔ جمال کے سرخ سپید چہرے پر ایک رنگ آتا ہے ایک جاتا ہے اور جب وہ اُن مصرعوں پر پہنچتے ہیں:

....

پان والے سے جا کے پوچھا پتا
بولا " وہ اس گلی میں رہتا ہے
میرا بھی اس پہ قرض باقی ہے"

تو جمال کو ضبط کا یارا نہیں رہتا اور وہ اپنی چپّل سے حلیم کو نشانہ بناتے ہیں۔ چپّل تو خیر حلیم کے کان کے پاس سے نکل جاتی ہے لیکن یہ دونوں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں اور قبل اس کے کہ احباب بیچ بچاؤ کریں، جمال کا چشمہ حلیم کے حملہ کی تاب نہ لا کر گر جاتا ہے اور اس کے دونوں شیشے پتھر سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتے ہیں۔ سنہری کمانی کا یہ خوبصورت چشمہ جمال اسی دن پہلی بار پہن کر آئے ہیں۔ حلیم کمانی اُٹھا کر ان کے ہاتھ میں دیتے ہیں تو جمال کہتے ہیں:

"گھر کیسے جاؤں گا؟"

حلیم انہیں اپنی سائیکل پر بٹھا کر امین آباد تو پہنچا دیتے ہیں لیکن راستہ میں اُن سے بات نہیں کرتے۔ اس واقعہ کو بمشکل تین ہی چار دن گذرے تھے کہ ایک شام جمال نے حلیم کے مکان کے دروازے کی زنجیر کھٹکھٹائی۔ حلیم نے چھجے سے جھانک کر عابد سہیل سے کہا۔

"جمال ہے!"

"جمال۔۔؟"

حیرت اور خجالت دونوں کے چہروں پر تو بڑے لٹکائے تھی۔ حلیم نے دروازہ کھولا۔ جمال اندر آ گئے لیکن خاموشی نے دونوں کے زبانوں پر تالے ڈال رکھے ہیں۔

مکان کے بیرونی حصّے کی پہلی منزل کا بڑا سا کمرہ دوست یاروں کا اڈّہ تھا، جس کے زینے پر جمال کچھ اس طرح چڑھ رہے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، کمرے میں داخل ہوتے ہیں

لیکن خاموشی اب بھی ان تینوں کے درمیان دیوار بنی کھڑی ہے۔ اتنے میں جمالِ جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالتے ہیں۔

''صبح سے نوٹ کاٹ رہا ہے، خرچ کیسے کروں؟''

حلیم خان، جن کی پٹھانی ان کے آگے آگے چلتی ہے، نم آنکھوں سے جمال کو دیکھتے ہیں اور عابد سہیل جو اپنی شخصیت پر ایک دبیز نقاب ڈالے رہتے ہیں، دوسری طرف دیکھتے ہوئے اپنے آنسو پونچھتے ہیں لیکن اس طرح کہ دونوں میں سے کسی کی نظر نہ پڑے۔

جیب میں پیسے نہ ہوں تو جمال دوستوں سے بھی لڑ سکتے ہیں، اُن سے خُفا رہ سکتے ہیں، لیکن روپے ہاتھ آئے نہیں کہ انھیں دوستوں کی یاد آئی، بے تحاشہ یاد، جسے کوئی خفگی، کوئی ناراضگی، کوئی غصّہ روک نہیں سکتا۔۔۔۔اس دن کے بعد ان تینوں کے درمیان ٹیگور لائبریری کے سامنے والے لان کے واقعہ کا کبھی ذکر تک نہ آیا۔

جمال یکایک چُپ چپاتے علی گڑھ چلے گئے اور وہاں سے اُردو میں ایم۔اے کر کے لوٹے تو ''اسکالر'' کا پیروڈی نمبر ایڈیٹ کر چکے تھے۔ ہندستان اور پاکستان کے بہترین ادبی جریدے ان کے مضامین کے منتظر رہنے لگے تھے اور ان کے مزاحیہ مضمون ''ادب میں مارشل لا'' کو ادب میں وہی حیثیت حاصل ہو چکی تھی جو مارشل لا میں ایوب خاں کو حاصل ہے۔

بعض معاملات میں جمال انتہاؤں پر کار بند رہتے ہیں۔ کسی کی تعریف کرنے پر آئیں گے تو اسے حُسنِ یوسف، ید بیضا، دم عیسیٰ اور ہر ممکن خوبی سے متصف کر دیں گے اور کسی سے ناراض ہوں گے تو کون سا عیب ہے جو اس میں تلاش نہ کر لیں گے۔ بے پر کی اُڑئیں گے تو ایسی کہ بڑے سے بڑا داستان گو بھی پانی نہ پائے اور اگر جھوٹ پکڑ جائے تو فوراً معافی مانگ لیں گے۔ شہر میں کون ہے جو اُن کی اِن انتہاؤں کا شکار یا ان سے فیضیاب نہ ہوا ہو اور اگر کسی کو ان سے سابقہ نہیں پڑا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ جمال نے اسے کسی قابل ہی نہیں سمجھا۔

یہ تو خیر انسانی فطرت کی کمزوری ہے کہ اکثر صورتوں میں ہم وہ دیکھتے ہیں جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں، وہ سنتے ہیں جو سننا چاہتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں جو سمجھنا چاہتے ہیں اور اقدار کے وہ پیمانے بناتے ہیں جن کی ہمیں ضرورت ہوتی ہے اور ان کے لیے جواز تلاش کرتے ہیں، بہانے ڈھونڈتے ہیں، لیکن جمال کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے چاروں طرف جالے نہیں بُنتے، عظمت کے جالے، علم وفضل کے جالے، خوش اخلاقی کے جالے، تنک مزاجی کے جالے، بوہیمنیزم کے جالے۔۔۔ وہ جیسے ہیں ویسے ہی نظر آتے ہیں۔ اور اُن کے لیے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا۔ ع

''دیتا ہے دھوکا یہ بازی گر کھلا''

ایک دن بولے: ''انگریزی فلم سے مجھ سے زیادہ کوئی لطف نہیں لیتا۔۔۔!!''

عابد سہیل کو، جن کے بارے میں مشہور ہے کہ ''حلقۂ یاراں'' میں ان سے زیادہ انگریزی صرف تقی حیدر کو آتی ہے، یہ بات شاید کچھ پسند نہیں آئی اور انہوں نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

جمال نے وضاحت کی ''فلم دیکھنے کے دوران کسی واقعہ پر لوگ زوروں سے ہنستے ہیں تو میں بھی قہقہہ لگا دیتا ہوں، تھوڑی دیر بعد جب سب خاموش ہو جاتے ہیں تو پاس والی نشست پر بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھتا ہوں کہ لطیفہ کیا تھا اور وہ لاعلمی ظاہر کرتا ہے تو دوسرا قہقہہ لگاتا ہوں، اس کے بعد جب کسی سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہنسنے کی بات کیا تھی تو ایک بار اور قہقہہ لگاتا ہوں یعنی ایک ٹکٹ میں تین تماشے''۔

جمال کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ خود پر ہنسنا جانتا ہے۔ والد کا انتقال ہوا تو ''قومی آواز'' سے متعلق ہو چکے تھے، منہ بسورتے ہوئے آئے اور مسیح صاحب سے بولے۔

''ایسے میں کیا کیا کرنا ہوتا ہے؟ مجھے کوئی تجربہ نہیں، پہلا پہلا معاملہ ہے''۔

جمال نے ''اودھ پنچ'' کو ازسرِ نو زندہ کیا تو درمیانی سائز کا چمڑے کا ایک بیگ ہر وقت ہاتھ میں رہنے لگا۔ اس میں دو چار شمارے ہوتے اور وہ ہر جان پہچان والے کو رسالہ کا خریدار

بنانے کی کوشش کرتے۔ دوست یاروں سے تو انہیں صرف وعدے ہاتھ لگے لیکن سیکڑوں شناساؤں میں سے تھوڑے بہت خریدار بن گئے۔ حضرت گنج میں مقیم اپنے ایک شناسا کے یہاں بھی اسی مقصد سے گئے۔ انہوں نے نہایت خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا۔ خوب عمدہ ناشتہ کرایا اور اپنی کار سے امین آباد تک انہیں پہنچا بھی آئے۔ رخصت ہوتے وقت جمال کے چہرے پر زرِسالانہ کی درخواست کے مثبت جواب کی تمنا پڑھی تو کار موڑتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''پرسوں ملاقات ہوگی''۔

جمال 'پرسوں'' ان کے یہاں پہنچے تو وہ گھر سے نکل ہی رہے تھے۔ نہایت پرُ جوش خیر مقدم کیا اور کار میں بٹھا کر کوالٹی ریسٹورنٹ لے آئے جہاں انہوں نے آئس کریم، کیک، پیسٹری اور ٹھنڈی کافی سے ان کی ضیافت کی، لیکن ''اودھ پنچ'' کی سالانہ خریداری قبول کرنے کا سوال اپنی جگہ قائم رہا۔ یہ سلسلہ کئی ہوٹلوں، سنیما گھروں اور ضیافتوں سے ہوتا ہوا ڈیڑھ دو مہینے بعد اس وقت ختم ہوا جب ایک دن انہوں نے کہا۔

''بھائی جمال! میں سالانہ خریدار بننے کا قائل نہیں۔ ویسے تم ہر مہینے پچیس تیس روپے لے لیا کرو''۔

اس وقت ''اُودھ پنچ'' کا زرِسالانہ زیادہ سے زیادہ چار روپے رہا ہوگا۔

جمال نے اس کوچہ میں دوبارہ قدم نہیں رکھا۔

بعض حالات نے جمال کو تالا کھولنے کا ماہر بنا دیا تھا لیکن کسی دوست یا حاجت مند کی مشکل کشائی اور گھر کے نعمت خانہ سے کسی بھوکے دوست کے لیے کھانا نکالنے کی مجبوری کے علاوہ انہوں نے اس مہارت سے کبھی کام نہیں لیا۔

''قومی آواز'' میں اُن کی ڈیوٹی رات کی تھی، دن میں یوں ہی دفتر پہنچے تو دیکھا کہ ادارتی کاموں سے متعلق سارا عملہ اِدھر اُدھر ٹہل رہا ہے کیوں کہ ہر کمرہ پر تالا لٹکا ہوا ہے اور ''ہم

تم ایک کمرے میں بند ہوں'' والی صورت کے بغیر ہی چابی کھوگئی ہے۔ دوسرا چپراسی بھیج کر مدار بخش کو گھر سے بُلایا گیا تو معلوم ہوا کہ چابی کا گچھا انہوں نے حسبِ دستور ٹائم آفس میں دے دیا تھا۔ رجسٹر کے اندراجات بھی ان کے دعوے کی تصدیق کرتے تھے۔ جمال اس وقت پہنچے تھے جب تالے توڑنے کا فیصلہ تقریباً کیا جا چکا تھا۔ ان کی فرمائش پر کہیں سے کوئی ایک ذرا لمبی کیل لے آیا۔ جمال ایک ایک تالے کو اپنے بائیں ہاتھ میں لے کر اس پر داہنے ہاتھ کی بیچ کی انگلی موڑ کر ہڈی سے باری باری ضرب دیتے اور اس عمل سے پیدا ہونے والی آواز کان لگا کر سنتے۔ پھر چابی کی جگہ میں کسی مخصوص زاویہ سے کیل داخل کرتے اور آن کی آن میں تالا کھل جاتا۔ بمشکل چار منٹ میں تین موٹے موٹے تالے ''ٹوٹے ہوئے پیمانوں'' کی طرح اپنی عظمتِ رفتہ پر آنسو بہا رہے تھے۔

کسی نے ان کے اس ''فن'' کی تعریف کی تو مسکرا کر بولے۔

''چھوٹے موٹے تالے کو بس پانچ منٹ گھور کے دیکھوں تو خود بخود کھل جائے اور کیل کی ضرورت بھی نہ پڑے''۔ اور اپنے حساب سے بات ختم کردی۔

جمال بہت بڑے سوشلسٹ ہیں لیکن پارٹی والے نہیں، بلکہ جو چیز جس کے پاس ہونا چاہیے وہ اس تک پہنچانے والے۔

یونیورسٹی میں کیشیر آفس کے سامنے عارف نقوی نے عابد سہیل سے قلم مانگا تو اُنہوں نے جیب سے نکال کر اُن کی طرف بڑھا دیا۔ عارف نقوی نے فارم کی خانہ پُری کرکے قلم واپس کردیا۔ اور دونوں دھیرے دھیرے لائبریری کی طرف بڑھنے لگے لیکن عارف نقوی خلافِ معمول خاموش ہیں۔

''کیا بات ہے؟'' عابد سہیل نے پوچھا، جس کا جواب اُنہوں نے خاموشی سے دیا۔ آخر بے حد اصرار کے بعد اُنہوں نے صرف اتنا کہا۔

''یہ قلم آپ کا ہے؟''

''نہیں، جمال نے دیا ہے۔ کیوں کیا بات ہے؟''

عارف نقوی نے کوئی جواب نہیں دیا، لیکن عابد سہیل کو شبہ ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے، آخر ان کے بار بار پوچھنے پر عارف نقوی نے تسلیم کر ہی لیا کہ یہ قلم اُن کا ہے۔ اتفاق سے اسی وقت جمال بھی کہیں سے آ نکلے۔ انھیں دیکھتے ہی عابد سہیل کے غصّے کا پارہ ایک دم اُونچا ہو گیا۔

''تم نے عارف نقوی کا قلم مجھے کیوں دے دیا تھا؟'' وہ گرجے۔

''قلم؟'' جمال ہنسنے لگے۔ پھر عارف نقوی کی طرف مخاطب ہو کر بولے

''اس کے کس کام کا ہے؟''

لیکن اگلے ہی جملے میں اُنہوں نے ''اِس کے'' کو ''تمھارے'' سے تبدیل کر دیا۔

''تمھارا کام تو معمولی سے قلم سے بھی چل جائے گا۔ ایسا قلم تو 'استاد' کے پاس ہونا چاہیے، سو میں نے اُنھیں دے دیا''۔

جب سے عابد سہیل نے ان کے ابتدائی مضامین اشاعت سے قبل اُلٹ پلٹ کے دیکھے تھے، وہ انہیں استاد ہی کہتے تھے۔

جمال کی اس ہٹ دھرمی پر عارف نقوی اور عابد سہیل دونوں ہی ہنس دیے اور قلم اُس کے مالک کو واپس مل گیا۔

یہ قلم پارکر کمپنی کا تھا۔

جمال کی بیوی اُنہیں رخصت کرا کے اپنے مائکے یعنی سیوان (بہار) لے جانے لگیں تو شہر کے ادیبوں نے چارباغ اسٹیشن پر انھیں نم اور چھلکتی ہوئی آنکھوں سے رخصت کیا۔ جمال سنجیدہ اور کسی قدر اُداس اور دِل گرفتہ شاید پہلی بار نظر آئے۔ انہیں اس حالت میں پہلے کسی نے کم ہی دیکھا تھا۔ ایسا نہیں کہ انہیں پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو، لیکن انہیں بڑے سے بڑے غم

اور پریشانی کو مسکراہٹوں میں بدل دینے کا گُر آتا ہے۔اس کے باوجود ان کا یہ گُر بھی اس وقت کام نہ آیا جب ان کے گھر پر حلیم کو ذلیل کیا گیا اور احتجاجاً انہوں نے تاج ریسٹورنٹ میں چائے کی پیالی میں زہر گھول کر خودکشی تک کرنے کی کوشش کی۔اسپتال لے جائے گئے،طبّی سہولت فوراً فراہم ہوجانے سے جان بچ گئی اور یونیورسٹی کے طلبہ کی یونین کے صدر کی کوششوں سے پولیس کو مداخلت کا موقعہ بھی نہ مل سکا۔اس واقعہ پر تاج ہوٹل کے مالک کا یہ جملہ۔۔۔''جمال کو جان دینے کے لیے کوئی اور ٹھور ٹھکانہ نہیں ملا۔آدھے گھنٹے کی بکّری ماری گئی''۔۔۔یاد کر کرکے جمال اکثر و بیشتر ہنستے تھے۔

ان کے لیے سیوان منتقل ہونے کا فیصلہ کوئی آسان کام نہ تھا۔مہینوں سوچتے رہے۔''قومی آواز'' سے مستعفی ہونے کے لیے خط لکھتے۔۔۔بار بار پڑھتے۔۔۔پھر یہ خط کئی دن تک جیب میں پڑا رہتا اور آخرکار پھاڑ کر پھینک دیا جاتا۔کبھی ہنستے ہنستے یکایک خاموش ہوجاتے۔۔لیکن ہوا وہی جو اُن کی اہلیہ نے چاہا۔

جمال سیوان چلے تو گئے لیکن لکھنؤ کو بھلا نہ سکے۔اپنے دوستوں کے نام خطوط اور ہر سال پندرہ بیس دن شہر میں قیام کے ذریعہ، جس کی نوبت کبھی کبھی ساتویں آٹھویں مہینے بھی آجاتی، اُنہوں نے اپنی علمی اور ادبی کارگاہ سے زندہ رشتہ استوار رکھا۔لکھنؤ آتے تو محسوس ہوتا جیسے یہاں سے کبھی گئے ہی نہ تھے،ایک ایک دوست سے ملاقات کرتے،گپ بازیاں ہوتیں، قہقہے لگتے،امین آباد میں ان کے پسندیدہ ہوٹلوں۔۔۔تاج اور سندر سنگھ۔۔۔اور حضرت گنج کے کافی ہاؤس میں ان کے دوستوں کا جمگھٹا لگ جاتا۔

لکھنؤ آتے تو خالی ہاتھ لیکن واپسی میں کتابوں کے دو تین بنڈل ضرور ان کے ساتھ ہوتے۔دوسری کتابوں کے ساتھ طنز و مزاح سے متعلق ہر کتاب جو ان کی ذاتی لائبریری میں نہ ہوتی، خرید کر لے جاتے۔۔۔کچھ نہ کچھ کتابیں دوستداری میں بھی خرید لیتے۔

اور پھر انہوں نے مزاحیہ ادب سے متعلق سیوان میں ہی ''احمد جمال پاشا انسٹی ٹیوٹ'' قائم

کیا جس سے مستفیض ہونے کے لیے سارے ملک بلکہ بیرون ملک تک سے اسکالرز آتے رہتے۔

اہلیہ کی معیت میں فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے روانگی سے چند روز قبل انہوں نے عابد سہیل کو خط لکھا۔

''یا امیر المتشکّکین! حج کرنے جا رہا ہوں۔ آپ کے لیے دُعا کروں گا کہ خدا آپ کے اِرادوں کو پائے اِستقامت سے سرفراز فرمائے۔ ویسے ان دنوں ہوم ورک بہت کرنا پڑ رہا ہے''۔

اُن کا خط پڑھ کر عابد سہیل کو وہ تصویر یاد آ گئی جس میں چالیس پینتالیس سال قبل کے لکھنؤ کا ایک نوجوان لندن میں کارل مارکس کی قبر پر دُعا مانگ رہا تھا ''یا اللہ مسلمانوں کو مارکس کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما''۔

یہ دُعا تصویر کی پُشت پر درج تھی جسے پڑھ کر ہم لوگ خوب ہنسے تھے لیکن رضیہ آپا نے تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا تھا ''تحقیق طلب امر یہ ہے کہ مارکس کی قبر پر یہ وینٹی بیگ کس خاتون کا رکھا ہوا ہے۔''

آخری بار لکھنؤ آئے تو ان کا سرخ وسپید چہرہ داڑھی سے منوّر تھا۔ کھچڑی بالوں کی مختصر سی داڑھی میں کچھ زیادہ ہی اچھے لگ رہے تھے لیکن پہلے کی جملے بازی اور بات بات پر چٹکلے سنانا ختم ہو چکا تھا۔

سیوان واپس جانے سے پہلے ملنے آئے تو معمول کے برخلاف صرف پندرہ بیس منٹ بیٹھے اور اُکھڑے اُکھڑے لہجہ میں بات کرتے رہے، دس ہی منٹ کے بعد اُٹھنے لگے تو میں نے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کے بٹھا دیا۔ باتیں اس کے بعد بھی کیں لیکن ان میں نہ کوئی طنز تھا نہ مزاح، نہ تازگی جوان کی شخصیت سے عبارت تھے۔ نہ کوئی جملہ بازی کی، نہ کوئی بے ضرر جھوٹ (White lie) ہی بولا۔ پھر یکایک ''اَب چل چلاؤ ہے'' کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اُن کے مونہہ سے یہ جملہ سن کر تو میں کانپ ہی اُٹھا۔ ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکل سکا۔ گفتگو کے اس حیرت خیز موڑ کے اثر سے خود کو آزاد کرنے کے لیے ان کے ساتھ باہر تک چلا

آیا اور ''مکتبۂ دِین و اَدب'' کے پاس بجلی کے کھمبے کو سہارا دینے والے موٹے سے تار کے پاس کھڑے کھڑے تقریباً آدھ گھنٹے تک ان سے بات کرتا رہا۔ اُسی رات جمال سیوان چلے گئے لیکن جب بھی اُن کا جملہ یاد آتا دِل تیزی سے دھڑکنے لگتا۔

ماضی اور حال کی یہ دھوپ چھاؤں اب ختم کرنی ہی ہوگی کہ سفّاک حقیقت سے کوئی کب تک چشم پوشی کر سکتا ہے۔

چند ماہ بعد اخبار کے ذریعہ اُن کے انتقال کی خبر ملی، دِل نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ آنکھوں نے جو کچھ پڑھا اس پر چند لمحوں تک یقین ہی نہ آیا۔ جمال ایسے خوش مزاج اور ہنس مکھ شخص کو بھی دِل دھوکا دے سکتا ہے، کون مان سکتا تھا، لیکن کوئی خود کو کب تک دھوکا دیتا۔؟

تفصیلات بعد میں معلوم ہوئیں۔ ایک عرصہ سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے، لیکن گھر میں کسی کو بھنک تک نہیں لگنے دی تھی۔ دوائیں برابر لیتے رہتے تھے لیکن بیماری کا علم انہوں نے اہلیہ تک کو نہیں ہونے دیا تھا۔

اُردو اکادمی (قیصر باغ) کے ہال میں معینہ وقت سے بہت پہلے ہی آنے والوں کا تانتا بندھ گیا اور تعزیتی جلسہ شروع ہونے سے قبل ہی وسیع ہال اور داہنی جانب کی چھت ان کے مدّاحوں، ادیبوں، شاعروں اور ادب سے دلچسپی لینے والوں سے چھلک پڑی۔ بعد میں آنے والوں کو گیلری میں بمشکل کھڑے ہونے بھر کی جگہ مل سکی۔

مجازؔ کے انتقال کے بعد شہر نے کسی ادیب کا ایسا پُر ہجوم تعزیتی جلسہ پہلی بار دیکھا۔ شاید ہی کوئی مقرر ہو جس کی آنکھوں میں آنسو نہ تیر آئے ہوں، بعض تو بمشکل چند الفاظ ہی ادا کر سکے۔

■■

مقبول احمد لاری

اصل مضمون کے بارے میں پہلے کچھ باتیں۔

پچھلی صدی کی آخری دہائی کے چوتھے یا پانچویں برس میں ایک دن ''میرا اکادمی'' کی مجوزہ تقریب کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر احمر لاری نے بتایا کہ اس موقعہ پر مقبول احمد لاری صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے ایک کتاب بھی شائع ہوگی۔ یہ کوئی نئ بات نہ تھی۔ پہلے بھی اس طرح کی ایک کتاب شائع ہو چکی تھی۔ چنانچہ میں خاموش رہا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر لاری نے دریافت کیا کہ کیا میں ایک مختصر سا مضمون لکھنا پسند کروں گا؟ میں اس سوال کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد میں نے کہا ''جواب کل دوں، کوئی حرج تو نہیں؟'' ڈاکٹر صاحب نے جن سے میرے دیرینہ مراسم ہیں، کہا ''چلیے کل ہی سہی''۔

اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں اور میں اپنا وعدہ بالکل بھول گیا۔ اگلے دن ڈاکٹر لاری آئے، تو انہیں دیکھتے ہی مجھے اپنے وعدے کا خیال آیا۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے اس سلسلے میں دریافت کیا، تو میں نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا۔

''ضرور لکھوں گا، لیکن ایک شرط پر''

''وہ کیا؟''

''جو کچھ بھی لکھوں گا اس میں نہ ایک لفظ کا اضافہ ممکن ہوگا نہ ایک لفظ کی کمی''

احمر لاری کچھ سوچنے لگے، پھر بولے۔

''اور میں بھی جواب کے لیے ۲۴ گھنٹوں کی مہلت مانگوں تو؟''

''کوئی حرج نہیں'' میں نے کہا، اس یقین کے ساتھ کہ ایسے مواقع پر جس قسم کے مجلّے شائع ہوتے ہیں، ان میں شامل کیے جانے والے کسی مضمون کے سلسلے میں اس طرح کی شرط ہرگز قابلِ قبول نہ ہوگی اور میں ''فرمائشی مضمون'' لکھنے سے بچ جاؤں گا۔

میں مقبول احمد صاحب کے یہاں حاضری نہیں لگاتا (لفظ ''حاضری'' کے استعمال میں ذم کا کوئی پہلو ہرگز نہیں۔ بارہا جی چاہتا ہے کہ ان سے ملاقات کے لیے جاؤں لیکن اپنی مصروفیات کے سبب یہ خواہش بیشتر صورتوں میں پوری نہیں ہو پاتی) ان کی تعریف و توصیف میں کبھی میں نے ایک جملہ نہیں لکھا اور وہ میرے سیاسی خیالات سے بھی واقف ضرور ہوں گے، اس لیے اس باب کو اب ختم ہی سمجھنا چاہیے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اگلے دن ڈاکٹر لاری نے کہا ''مجھے آپ کی شرط منظور ہے''۔

یہاں اس راز پر سے پردہ اُٹھانے میں کوئی حرج نہیں کہ ''میرا اکادمی'' کی سرگرمیوں کے روحِ رواں احمر لاری ہی ہیں، لیکن تقریبات کے دوران تیسری چوتھی صف میں ایسے بے تعلق بنے بیٹھے رہتے ہیں جیسے اس سارے تام جھام سے ان کا کچھ بھی لینا دینا نہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے میری شرط کے بارے میں مقبول احمد لاری صاحب سے جو ہر تقریب میں لاکھوں روپے خرچ کر دیتے ہیں، مشورہ ضرور کیا ہوگا۔

میں تو مطمئن تھا کہ اس بکھیڑے سے نجات مل جائے گی، لیکن ڈاکٹر لاری کے جواب نے مجھے پریشانی میں ڈال دیا۔ چنانچہ میں نے پندرہ دن کی مہلت طلب کی جو فوراً ہی مل گئی۔

مختصر سا مضمون لکھنے کے لیے پندرہ دن بہت ہوتے ہیں لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ دو ہفتے کیا ایک سال میں بھی یہ مضمون نہ لکھ سکوں گا۔

اخبارات میں تقریباً مستقلاً رات کی ڈیوٹی کرنے کے سبب دیر سے سونے کا عادی ہو گیا ہوں۔ خالی وقت کیسے کاٹوں، چنانچہ کچھ نہ کچھ پڑھتا ہوں یا پھر لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ ایک رات کچھ ایسا ہوا کہ میں بستر پر دراز ہو کر پڑھنے کے بجائے لکھنے کی میز پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک اُلٹے سیدھے جملے لکھتا رہا۔ اسی دوران ایک عنوان ذہن میں کوندے کی طرح لپکا۔۔۔ ''اجنبیت سے تعلقِ خاطر تک''[۱]۔۔۔ ظاہر ہے لاری صاحب پر مضمون لکھنے کا خیال شعور کی زیریں (زیریں ترین نہیں) سطح پر ضرور موجود رہا ہوگا۔ عنوان نے ذہن کو اس طرح روشن کیا کہ مضمون، تحریری شکل اختیار کرنے کے لیے، قلم کو اُکسانے لگا۔

میں نے قلم اُٹھایا اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں مضمون مکمل ہو گیا۔ اسی وقت شروع سے آخر تک پڑھا، کچھ ایسا خراب نہ معلوم ہوا۔ اگلے دن مضمون ہاتھ روک کر نقل کیا کہ بہت بدخط ہوں اور بریف کیس میں رکھ لیا۔

تین چار دن کے بعد احمر لاری تشریف لائے تو میں نے لفافہ انہیں پیش کر دیا جسے کچھ کہے بغیر انہوں نے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ خاصی مایوسی ہوئی۔ اچھا بُرا کچھ تو کہتے۔ میں سمجھتا تھا کہ عنوان دیکھتے ہی وہ مضمون واپس کر دیں گے۔ لیکن انہوں نے تو لفافہ تک نہ کھولا۔

چند دنوں بعد پھر ملاقات ہوئی۔ مضمون کا ذکر نہ انہوں نے کیا، نہ میں نے۔

آخر کتاب شائع ہو گئی۔ اپنا مضمون، خاص طور سے عنوان، دیکھ کر ایک گونہ حیرت ہوئی اور سکون بھی ہوا۔ اس وقت دل کا ایک چور بھی بتا دوں۔ میں نے مضمون کی نقل رکھ لی تھی تا کہ شائع ہونے کی صورت میں اصل سے موازنہ کر سکوں۔ لیکن عنوان ہی دیکھ کر اس قدر مطمئن ہو گیا کہ مطبوعہ مضمون پڑھا بھی نہیں۔ اس کی نقل یا تو کھو گئی یا کاغذات کے انبار میں کہیں دبی

۱۔ مذکورہ کتاب میں یہ مضمون اسی عنوان سے شائع ہوا تھا۔

ہوگی۔ لیکن ''بوقت ضرورت'' ملی نہیں۔

یہ ''بوقت ضرورت'' بھی تشریح طلب ہے۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ کئی خاکے یا خاکہ نما چیزیں لکھ چکا ہوں، کیوں نہ انہیں کتابی شکل دے دوں۔ چنانچہ ''حیاتِ مقبول'' کی تلاش شروع ہوئی جو میری ذاتی کتابوں کے چھوٹے سے ذخیرہ میں نہیں ملی۔ لیکن اس سلسلے میں کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر احمر لاری نے میری درخواست پر کتاب کی دوسری جلد گورکھپور سے بھجوادی۔

اپنا مضمون دیکھا تو کچھ مختصر معلوم ہوا، چنانچہ اسے پڑھ ڈالا۔ میرا خیال درست تھا۔ ایک واقعہ، ایک پیراگراف پورے کا پورا اور چند جملے غائب تھے۔ باقی سارے مضمون میں ایک لفظ بھی تبدیل نہیں کیا گیا تھا۔ حیرت ہوئی، خاص طور سے یوں کہ حذف شدہ حصّہ سے مقبول احمد صاحب کے کردار کے ایک خوشگوار پہلو پر روشنی پڑتی تھی۔ حیران تھا کہ یہ واقعہ حذف کیوں کیا گیا اور یہ حیرانی اب بھی قائم ہے۔ ذہن نے طرح طرح سے تاویلیں کیں۔ لیکن کوئی اطمینان بخش جواب نہ مل سکا۔ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر لاری سے دریافت کیا تو انہوں نے حیرت اور مکمّل لاعلمی کا اظہار کیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ حصّہ یا تو جگہ کی کمی کے سبب نکال دینا پڑا یا ''حیاتِ مقبول'' کے مدیر نیاز قومی صاحب نے اسے اس قابل نہ سمجھا۔ ایک خیال یہ بھی ہوتا ہے کہ چوں کہ واقعہ کچھ ایسا ہے کہ اس سے مقبول صاحب کی شخصیت کے ایک تقریباً ناقابلِ یقین حد تک خوشگوار پہلو کا اظہار ہوتا ہے اس لیے انہوں نے ازراہِ انکسار اس کی شمولیت پسند نہ کی ہو۔ اس صورت میں ان سے شکایت ضرور رہے گی کیوں کہ انہیں میرے مضمون کی قیمت پر اپنی منکسر مزاجی کے مظاہرہ کا کوئی حق نہیں تھا۔

اب چونکہ یہ مضمون دوسرے خاکوں کے ساتھ کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے، میں نے اس حصّہ کو دوبارہ لکھ کر ممکنہ حد تک اسے مطابقِ اصل بنانے کی کوشش کی ہے۔

ہر تخلیق، حد یہ ہے کہ مضمون تک، کے **Original** ہونے کی ایک دلیل اس کا داخلی

ربط بھی ہوتا ہے جو ظاہر ہے مصنوعی طور پر پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خامی ممکن ہے پڑھنے والوں کو کھٹکے، کیوں کہ واقعاتی طور پر صحیح ہونے کے باوجود وہ کیفیت شاید ہی پیدا ہو سکی ہو جو اصل مضمون میں رہی ہوگی۔ ٹاٹ میں ٹاٹ کا پیوند بھی لگایا جائے تو چھپائے نہیں چھپتا اور رفوگری مجھے آتی نہیں۔

''پسِ نوشت'' کی سطریں بعد میں بڑھائی گئی ہیں۔ اُس وقت انہیں لکھنا ممکن ہی نہ تھا اور کتابی صورت میں مضمون کی اشاعت کے وقت اس واقعہ کے بیان سے احتراز برتنا ایک طرح کی احسان فراموشی ہوتی۔

مضمون اب پڑھیے۔

اس رشتہ کے بارے میں کچھ لکھنا، جس کی ابتدا اجنبیت بلکہ کسی قدر ناپسندیدگی سے ہوئی ہو اور جو تعلقِ خاطر میں تبدیل ہو گیا ہو، کس قدر دشوار ہے۔

سائکل پر نخاس سے قیصر باغ جاتے ہوئے سٹی اسٹیشن کے سامنے ایک مکان کے بڑے سے پھاٹک میں کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک بھاری بھرکم شخص پر نظر اکثر پڑتی۔ زیادہ تر صورتوں میں چار چھے لوگ سامنے کی کرسیوں پر بیٹھے ہوتے۔ دو ایک بار اُنہیں تنہا بیٹھے ہوئے بھی دیکھا۔ کبھی کبھی مکان کے پاس ایک کار نظر آتی جس سے اندازہ ہوتا کہ صاحبِ خانہ مالی حیثیت سے خاصے مضبوط ہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب شہر میں کاروں کی تعداد آج کے مقابلہ میں پانچ فی صد بھی نہ رہی ہوگی۔ یادش بخیر یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ملک میں کمیونسٹ تحریک اپنے عروج پر تھی اور نوجوانوں کی غالب اکثریت بائیں بازو کی فکر سے اپنے دماغوں کو اور خوابوں سے اپنے دلوں کو سجائے ہوئے تھی۔ ایسے میں کسی کا بے حد دولت مند ہونا ہی کسی خوش گمانی کے امکان کو ختم کرنے کے لیے کافی تھا۔

یہی صورت یہاں بھی ہوئی۔

کچھ دنوں بعد کسی صاحب سے موصوف کا نام معلوم ہوا۔ ''لاری''۔ کوئی کشش محسوس

نہ ہوئی۔ یہ بھی کوئی نام ہوا؟

کم وبیش چالیس سال قبل لکھنؤ سے ایک ادبی ماہنامہ کا اجرا ہوا جس سے میرا بے حد قریبی تعلّق تھا۔ چند شمارے شائع ہو چکے تھے کہ ایک دن اس دفتر میں جہاں میں ملازم تھا میرے لیے فون آیا۔ تار کے دوسرے سرے پر علاّمہ خیؔر بہوروی تھے۔ خیر بہوروی صاحب سے میں تو واقف تھا لیکن وہ بھی مجھے جانتے ہیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی۔

خیؔر بہوروی صاحب کے بارے میں، اس اطلاع کے بعد کہ وہ لاری صاحب کے یہاں رہتے ہیں، جتنی بھی خوش فہمی تھی جاتی رہی۔

مسلسل دو ماہ تک خیؔر صاحب مجھے لاری صاحب کے یہاں مدعو کرتے رہے اور میں برابر گریز کرتا رہا، بالآخر مجبور ہو کر ایک دن جانا ہی پڑا۔ لاری صاحب کے مکان کے باہری کمرے میں مجھے بٹھایا گیا۔ اس کمرے میں نہ اس طرح کے بڑے بڑے اور خوبصورت صوفے تھے جیسے دولت مندوں کے ڈرائنگ روموں میں پائے جاتے ہیں، نہ کسی اور طرح سے امارت کا اظہار ہوتا تھا۔ کمرے اور سڑک کے درمیان جو خالی جگہ تھی اسے باہر کی جانب تار کی جالیوں سے بند کر دیا گیا تھا۔ وہاں ایک رسی بندھی تھی جس پر کچھ کپڑے لٹکے ہوئے تھے، غالباً سکھانے کے لیے۔ کسی قدر سکون کا احساس ہوا۔ خیؔر صاحب نے ہم دنوں کا ایک دوسرے سے رسمی تعارف کرایا تو میں نے کہا "واقف ہوں"۔ (اگرچہ صورت سے پہچانتا تھا اور بس)

ناشتہ آیا جو اچھا خاصا تھا۔ کئی قسم کے بسکٹ تھے، پھل تھے اور کیتلی میں چائے، اپنی "اہمیت" کے احساس سے نفس کچھ موٹا ہوا۔ (بہت دنوں بعد معلوم ہوا کہ ان کے یہاں جانے والے ہر شخص کی ضیافت اسی طرح کی جاتی ہے) اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر کتاؔب کا ذکر نکلا۔ دو چار باتیں خیؔر صاحب نے کیں۔ اس کے بعد لاری صاحب نے کہا۔۔۔۔"

"کتاؔب کو لکھنؤ کا نمائندہ پرچہ بنائیے" (الفاظ بالکل یہی تھے)

''کوشش تو کرتا ہوں کہ لکھنؤ کے ادیبوں اور شاعروں کی چیزیں چھاپوں''

''جی ہاں، پرچہ میں نے دیکھا ہے لیکن اسے لکھنؤ کی نمائندگی کرنی چاہیے''

''مزید کوشش کروں گا'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

اس کے بعد غیر متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ ایسی باتیں جن کی نوعیت کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں۔ تھوڑی دیر بعد لاری صاحب نے پوچھا

''آپ رسالہ چھاپتے کیسے ہیں؟''

میں نے اس سوال کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ یہ بھی خیال ہوا کہ شاید جملہ پوری طرح سن نہیں پایا ہوں۔ اس لیے گول مول سا جواب دے دیا اور پہلے والی گفتگو کا سرا جوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد لاری صاحب نے اپنا سوال دہرایا۔

''آپ رسالہ چھاپتے کیسے ہیں؟''

''کتابت کرا کے کاپیاں پریس کے حوالے کر دیتا ہوں'' میں نے بے دلی سے جواب دیا۔

خاموشی دو تین منٹ تک چھائی رہی۔

''سالانہ چندہ کیا ہے؟''

''چندہ نہیں زرِ سالانہ''

''جی ہاں، وہی، وہی''

''چھے روپئے۔''

اس ملاقات کے خاتمہ پر چھے روپے میری جیب میں تھے۔

ماہنامہ کتاب ایک سال تک لاری صاحب کو بھیجا جاتا رہا۔ بارہویں شمارے کے ساتھ یہ اطلاع دی گئی کہ زرِ سالانہ ختم ہو گیا ہے۔ تجدیدِ خریداری منظور ہو تو مطلع فرمایئے۔ کوئی جواب نہیں ملا اور رسالہ کی ترسیل روک دی گئی۔

(کئی برس بعد ایک دن رام لعل صاحب نے بتایا کہ لاری صاحب کہہ رہے تھے "سہیل صاحب نے کتاب بھیجنا ہی بند کر دیا، زرِ سالانہ تو بھیج ہی دیا جاتا"۔)

ایک دن یاد نہیں کس سلسلے میں جمیل مہدی صاحب سے ملاقات کرنے ان کی قیام گاہ (گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس) گیا۔ بہت دیر تک دُنیا جہاں کی باتیں ہوتی رہیں۔ معلوم نہیں کیسے لاری صاحب کا ذکر آ گیا اور اس "مردِ قلندر" نے ان کی اس قدر تعریف کی کہ میرا دل کچھ کچھ پسیجا۔ جمیل مہدی ایسا بے ریا، بے غرض اور مونہہ پھٹ ہونے کی حد تک صاف گو شخص تعریف کرتا ہے تو کچھ نہ کچھ اصلیت ہوگی ضرور۔ لاری صاحب کے بارے میں اپنے تصوارت کی حفاظت کے لیے جو اسلحہ سجائے تھے، کسی قدر کُند ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ احتشام صاحب بھی ان کی تعریف کرتے تھے اور الہ آباد منتقل ہونے کے بعد لکھنؤ میں کئی بار ان کے مہمان بھی رہے تھے۔ احتشام صاحب کی یہ ادا جن چند لوگوں کو پسند نہ تھی ان میں، مَیں بھی تھا۔

اپنا افسانوی مجموعہ جمیل مہدی صاحب کو پہلے ہی دے چکا تھا۔ میرا اکادمی کا انعام غالباً ان کے ایما پر ہی مجھے دیا گیا کیوں کہ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے اپنی کتاب انعام کے لیے داخل نہیں کی تھی۔ لیکن اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

تقسیمِ انعامات کی تقریب نہایت دھوم دھام سے ہوئی۔ بہار کے وزیرِ اعلیٰ مسٹر جگن ناتھ مشرا، یو پی کے وزیرِ اعلیٰ مسٹر وشوناتھ پرتاپ سنگھ، بہار کے ایک وزیر شمائل نبی اور سو سے زائد مشاہیرِ علم و ادب موجود تھے۔

یہ جلسہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ لاری صاحب نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں بہار میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے لیے مسٹر جگن ناتھ مسرا کی بے حد تعریف کرتے ہوئے مسٹر وی پی سنگھ سے بھی انھی خطوط پر اتر پردیش میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ مسرا جی نے بھی لاری صاحب کے موقف کی حمایت کی تھی اور اسی

جلسہ میں مسٹر وی پی سنگھ نے اُردو کے سلسلے میں وعدہ کرتے ہوئے ''مرد کی زبان ایک'' والا اپنا مشہور جملہ کہا تھا۔

بعد میں وی پی سنگھ نے اپنا وعدہ پورا کرنے کی کوشش بھی کی لیکن ہندی ساہتیہ سمیلن کے ہائی کورٹ سے ''اسٹے آرڈر'' حاصل کر لینے اور کانگریس کی مرکزی قیادت کے سرد رویہ کے سبب وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے اور انہیں وزارتِ اعلیٰ کے عہدہ سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔[1]

اس تقریب کے دوران لاری صاحب کی خود کو نمایاں کرنے کی کوشش سے احتراز نے متاثر کیا اور سال دو سال میں ایک آدھ بار اقبال منزل، جو اب مقبول احمد لاری منزل کے نام سے مشہور ہے، کبھی کبھی جانے لگا۔

اتفاق سے میری دو بچیاں جس اسکول میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں اسی میں لاری صاحب کی دونواسیاں بھی تھیں، میری بڑی بیٹی ان کی بڑی نواسی کے ساتھ اور میری چھوٹی بیٹی ان کی چھوٹی نواسی کے ساتھ۔ ان میں دوستی بھی تھی۔ اس دوستی کا دائرہ پھیلا تو لاری صاحب کی بیٹی رخسانہ نکہت لاری سے میری اہلیہ کی دوستی ہوگئی اور شادی بیاہ اور دوسری تقریبات میں ہم لوگ بھی مدعو کیے جانے لگے۔

۱۹۷۹ء میں حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ میں جس اخبار سے متعلق تھا اس میں کئی ماہ تک تنخواہیں ادا نہ کیے جانے کے بعد تالا بندی ہوگئی۔ انہی دنوں اتفاق سے امین آباد میں، سڑک سے ذرا ہٹ کر، ایک دکان مل گئی اور میری اہلیہ نے اُردو کتابوں کی ایک دُکان کھول لی۔

افتتاحی تقریب کا دعوت نامہ لے کر لاری صاحب کو مدعو کرنے میں خود گیا، صرف ایک دن قبل۔ انہوں نے معذرت کی کہ کل صبح ہی کانپور جانا ہے اور واپسی مغرب بعد ہوگی۔ اس کے بعد پوچھا ''جلسہ ٹھیک وقت پر شروع ہو جائے گا؟''

---

[1] یہ پورا پیراگراف بھی مطبوعہ مضمون سے غائب تھا۔ بعد میں مقبول لاری صاحب کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ وشوناتھ پرتاپ سنگھ سے کچھ ایسے خوش نہ تھے۔

''کوشش تو یہی ہوگی لیکن اس کا انحصار..........''

میں جملہ پورا بھی نہ کر پایا تھا کہ لاری صاحب نے کہا

''مشکل ہے''

جلسہ حسبِ دستور مقرّرہ وقت پر شروع نہ ہوسکا۔ چھوٹے سے اسٹیج پر حیات اللہ انصاری صاحب، پروفیسر شبیہہ الحسن نونہروی اور پروفیسر نو رالحسن ہاشمی تشریف فرما تھے۔ انتظامات کے سلسلے میں مجھے بار بار اِدھر اُدھر جانا پڑ تا تھا۔ لاری صاحب شاید میری غیر موجودگی میں تشریف لائے تھے اور کسی نے ان کو پہلی ہی صف میں بٹھا دیا تھا۔ میں نے حاضرین کی تعداد کا اندازہ لگانے کے لیے نظریں دوڑائیں تو لاری صاحب کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کانپور سے براہ راست یہیں آ گئے تھے۔

گرد کچھ اور بیٹھی۔

۱۹۸۵ء میں نیشنل ہیرالڈ سے مستعفی ہونے کے کئی ماہ بعد، شاید میرا اکادمی کی مطبوعات لینے کے لیے، لاری صاحب کے یہاں جانا ہوا۔ کچھ لوگ پہلے سے موجود تھے۔ تھوڑی دیر بعد نئے آنے والوں کے لیے چائے اور بسکٹ آئے۔ لوگوں کے آنے اور جانے کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے دوسروں کی موجودگی میں کتابوں کے سلسلے میں بات کرنے میں جھجک محسوس کی اور رخصت چاہی تو ہنس کر بولے۔

''ابھی بیٹھیے، آپ تشریف لاتے ہی کہاں ہیں''

میں نے تین چار بار اُٹھنا چاہا لیکن ہر بار اُنہوں نے اس خلوص سے روکا کہ میری ایک نہ چلی۔ آخر زیادہ تر لوگ رُخصت ہو گئے تو لاری صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''آپ نے اوپر والا ہال اور اس کی دیواروں کی روغنی پینٹنگس دیکھی ہیں؟''

''جی ہاں'' میں نے جواب دیا۔

''جی نہیں، میں آپ کو دکھاؤں گا'' انہوں نے کہا اور کرسی پر سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

ہال میں پہنچ کر اُنہوں نے نہ تو وہاں کی سجاوٹ دکھائی نہ دیواروں پر بنی ہوئی روغنی تصاویر، بلکہ کرسی پر بیٹھ گئے اور دوسری کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تشریف رکھیے''

میں بیٹھ گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ لاری صاحب کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن شاید مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ میں گم سم انہیں دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد بولے۔

''سنا ہے آپ نے ہیرالڈ چھوڑ دیا ہے۔''

''جی ہاں'' میں نے کہا۔

''دکان کیسی چل رہی ہے'' انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

''میں زیادہ چل رہا ہوں'' میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی اور اسی میں جملہ گڑبڑا گیا۔

خاموشی

نہ میں نے کچھ کہا، نہ انہوں نے۔

پھر کرسی پر سے اُٹھتے ہوئے، نظریں جھکائے جھکائے بولے۔

''میرے لائق کوئی خدمت ہو تو اس سے محروم نہ رکھیے گا''

مجھ پر پیمبری وقت پڑا تھا۔ قریب ترین عزیزوں اور عزیز ترین دوستوں (الا ایک دوست کے) کسی نے جھوٹے مونہہ بھی نہ پوچھا تھا کہ میاں کس حال میں ہو۔

میری آنکھوں میں آنسو تیر گئے، جنہیں پونچھنے کے لیے مجھے یہ کوشش بھی نہ کرنا پڑی کہ لاری صاحب دیکھ نہ لیں کیوں کہ وہ تو خود شرمندہ شرمندہ سے سر جھکائے ہوئے تھے۔

اُنہوں نے نہ ہزار روپے دیے، نہ دس ہزار۔

وہ اتنے چھوٹے نہیں ہیں۔

میں نے بھی موقع سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔

میں بھی اتنا چھوٹا نہیں ہوں۔

لیکن اب مطلع صاف تھا اور لاری صاحب مجھے ویسے ہی نظر آنے لگے تھے جیسے کہ وہ ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اگر آپ ۱۶ برس کی عمر میں خوبصورت نظر نہیں آتے تو یہ آپ کا قصور نہیں لیکن اگر ۶۰ برس کی عمر میں بھی خوبصورت نظر نہیں آتے تو یقیناً قصوروار آپ ہی ہیں کیوں کہ اس عمر میں انسان اس حُسن سے نہیں پرکھا جاتا جو کھال کے اُوپر ہوتا ہے بلکہ خوبصورتی کی پرکھ کا معیار اُس کی پوری شخصیت میں، جس میں اس کے اعمال بھی شامل ہیں، تبدیل ہو جاتا ہے۔

اپنی بڑی بیٹی صبا سہیل کی شادی کی تقریب کا دعوت نامہ لے کر لاری صاحب کے یہاں خود ہی گیا۔ ویسے بھی یہی کرتا لیکن اس وقت ایسا کرنے میں ایک غرض بھی شامل تھی۔ انہوں نے کارڈ پڑھا۔ بہت خوش ہوئے اور مبارکباد دی، جس کے بعد میں نے اپنا مدّعا بیان کیا۔
بیٹی کی شادی کے سلسلے میں پیغام تو تقریباً ایک سال قبل آیا تھا لیکن اس وقت صبا نے بی۔ اے کے پہلے سال کا امتحان پاس کیا تھا اور میں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی تھی کہ گریجویشن مکمل کرنے کے بعد ہی شادی ممکن ہے۔ اس کے بعد ہر دو جانب سے مکمل خاموشی رہی اور ہم لوگ یہ سمجھے کہ بات آئی گئی ہوئی لیکن جس دن صبا کا بی۔ اے فائنل کا آخری پرچہ ہوا، پیغام آیا کہ ہم لوگوں نے اتنے دِنوں انتظار کیا ہے، اب شادی پندرہ دن میں کر دیجیے۔
اس دوران یہاں دُنیا ہی بدل گئی تھی۔ میں نیشنل ہیرالڈ سے مستعفی ہو چکا تھا۔ تنخواہ ویسے بھی دوسرے تیسرے مہینے قسطوں میں ملتی تھی، پھر بھی اُمید تھی کہ گریچوئٹی کی رقم تو یکمشت مل ہی جائے گی۔ لیکن ایک پیسہ بھی نہ ملا۔

ہونے والے داماد وزارتِ اطلاعات ونشرواشاعت میں ایک خاصے اچھے عہدے پر تھے۔ ان کی بس ایک خواہش تھی کہ دس پندرہ افراد کی بارات کے قیام کا معقول انتظام کیا جائے (طعام کا

کوئی ذکر نہ تھا) اور یہاں یہ حال تھا کہ امین آباد کے ''گلمرگ ہوٹل'' کا تصور بھی آج کے ''ہوٹل تاج'' سے کسی طرح کم نہ تھا۔ مولوی گنج کے ایک گیسٹ ہاؤس پر نظرِ انتخاب پڑی، صاف ستھرا تھا اور ہم لوگ اس کے اخراجات کے متحمل بھی ہو سکتے تھے لیکن وہاں قباحت یہ تھی کہ دس پندرہ افراد کا کھانا بھی اُوپر کی منزل پر نہیں پکوایا جا سکتا تھا۔ میرا بیٹا ساجد بمشکل نو دس برس کا تھا اور زرّیں اس سے بھی چھوٹی، یہ سارا انتظام کرتا کون؟

اُسی ادھیڑ بُن میں تھا کہ لاری صاحب کا خیال آیا۔ عرضِ مدعا کے لیے خود کو خاصی مشکل سے راضی کر سکا۔ میں نے گفتگو کا آغاز کچھ اس طرح کیا۔

''ان لوگوں کی خواہش ہے........مجھے معلوم ہے کہ آج تک اقبال منزل میں کوئی بارات نہیں ٹھہرائی گئی ہے اور یہ ایک غلط نظیر ہوگی۔''

لاری صاحب نے کہا ''میں نے سی۔ بی۔ گپتا تک سے معذرت کر لی تھی۔''

''جی ہاں ایک غلط روایت قائم ہو جائے گی'' میں نے کہا اور یہ سوچ کر کہ اگر میں فوراً چلا آیا تو اُنہیں تکلیف ہوگی، پانچ دس منٹ تک باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد جب اجازت لے کر کرسی سے اُٹھنے لگا تو انہوں نے کہا۔

''کوشش جاری رکھیے، کہیں تو بارات ٹھہرے گی ہی۔'' (جملہ اس سے زیادہ مثبت اور اُمید افزا تھا)

یہ جملہ سن کر میں پھر کرسی پر بیٹھ گیا (ویسے پوری طرح اُٹھا ہی کہاں تھا) اور اپنی بات میں مزید وزن پیدا کرنے کے لیے میں نے کہا۔

صرف پندرہ افراد ہوں گے۔ کھانا باہر پک جائے گا۔ آپ کو کوئی تکلیف۔۔۔۔۔''

ابھی میں جملہ مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ انہوں نے میری جانب کچھ ایسی نظر سے دیکھا جس میں ہلکی سی ناراضگی تھی۔

''بارات اقبال منزل میں ٹھہرے گی اور کھانے کا انتظام آپ کریں گے؟''

سرد ہوا کا ایک جھونکا نس نس کو چیرتا ہوا گزر گیا۔ اُن کے اِس جملہ کے بعد میں نے طے کر لیا کہ قیام کا مناسب انتظام ہو یا نہ ہو بارات اقبال منزل میں تو ہر گز نہیں ٹھہرائی جائے گی۔

لاری صاحب مزاجاً خاموش انسان ہیں۔ باتیں زیادہ نہیں کرتے، لیکن کبھی کبھی اُن کی باتیں مزہ دے جاتی ہیں۔

ایک دن یوں ہی لاری صاحب کے یہاں چلا گیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ لان کے سامنے صحن میں ایک تخت پر خوبصورت سا گدّا بچھا ہوا تھا۔ گاؤ تکیہ بھی رکھا تھا۔ کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ اتنے میں اندر سے کچھ بچّے آئے اور تخت کے آس پاس اُچھل کود کرنے لگے۔ کسی نے ان بچّوں پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ یکایک لاری صاحب مسکرائے اور بولے۔

''اُچک پھاند کرتے ہوئے یہ بچّے کتنے اچھے لگ رہے ہیں اور میں اسی طرح اُچکوں پھاندوں تو لوگ کہیں گے کہ پاگل ہو گیا ہے۔'' یہ کہہ کر خوب ہنسے۔

ایک اور موقعہ پر، ''اقبال منزل'' جانا ہوا۔ برسات کے دن تھے۔ شام تک آسمان صاف تھا ورنہ جانے کی ہمّت ہی نہ کرتا۔ یکایک بادل گھر آئے اور بجلی چمکنے لگی۔ میں نے چائے کا آخری گھونٹ حلق میں اتارا اور اجازت چاہی۔

''کافی دُور جانا ہے، علی گنج۔''

''آپ ہی کی ہمّت ہے'' کہہ کر لاری صاحب کسی قدر زور سے ہنسے اور بولے۔

''میں ہوتا تو اسی جگہ بیٹھا رہتا۔ آپ میں ہمّت ہے تو ضرور جایئے۔''

لاری صاحب سے ملاقاتوں کے درمیانی فاصلوں کا اب بھی وہی عالم ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ میرا اکادمی کی اس تقریب کے بعد، جسے اب کئی مہینے ہو چکے ہیں، ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں، لیکن اجنبیت کی دیواریں کب کی ڈھے چکی ہیں۔

لاری صاحب کا دوسرا نام ''میرا اکادمی'' بھی ہے۔ وہ شہر کے سب سے رئیس اُردو داں

نہیں ہیں۔ ایک سے ایک پیسے والا اس شہر میں پڑا ہے، لیکن لاکھوں روپے خرچ کرنا تو دور کی بات ان میں شاید دو چار ہی ایسے ہوں کہ جن کے گھروں میں اُردو کی دس بیس کتابیں بھی ہوں۔

اردو سے ان کی محبت کی تفصیلی اور مکمل داستان لکھنے کا حق تو رام لعل اور ملک زادہ منظور احمد صاحبان ہی کو ہے۔ میں تو بس اس قدر جانتا ہوں کہ اس زبان سے انہیں محبت ہے، ایسی محبت جو زبانی جمع خرچ تک محدود نہیں۔

پس نوشت

''حیاتِ مقبول'' میں اس مضمون کی اشاعت کے برسوں بعد مجھے یکایک پانچ ہزار روپوں کی ضرورت پڑگئی، ایسی ضرورت جو پوری کرنی ہی تھی۔ کئی دن سوچتا رہا۔ آخر فیصلہ کیا کہ لاری صاحب سے ذکر کیا جائے۔۔۔۔ لیکن وہ تو ہر وقت لوگوں میں گھرے رہتے ہیں، کیا کروں۔؟ آخر ایک دن دس گیارہ بجے کے قریب ان کے یہاں گیا۔ حسنِ اتفاق سے کوئی موجود نہ تھا۔ اس ڈر سے کہ کوئی ٹپک نہ پڑے، میں نے غیر متعلق باتوں میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنی ضرورت بیان کردی۔

خاموش رہے۔ کسی قسم کے ردِعمل کا اظہار نہ کیا۔ میں سمجھا تیر نشانہ پر نہیں بیٹھا اس لیے دوسری باتیں شروع کردیں۔ تقریباً پون گھنٹے کے بعد میں رخصت ہونے لگا تو کئی لوگ آ چکے تھے اور محفل سجنے لگی تھی۔ میں نے بریف کیس کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اُنہوں نے کرسی پر میری طرف ذرا سا جھکتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''کل تو آپ تشریف لائیں گے ہی، صبح کے وقت۔''

اور پھر آواز ذرا سی بُلند کرتے ہوئے انہوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

''آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں''

اگلے دن پہنچا تو ایک لفافہ میرا منتظر تھا۔

یہ رقم حسبِ وعدہ میں نے تین قسطوں میں ادا کر دی، اگر چہ اس عمل میں موعودہ مدت سے کچھ زیادہ وقت لگ گیا، لیکن اس سلسلے میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ کا ذکر ضروری ہے۔ ایک دن میری اہلیہ نے لاری صاحب کی بیٹی رخسانہ سے رابطہ قائم کرنا چاہا۔ فون لاری صاحب نے ہی اُٹھایا۔ انہوں نے آواز پہچان لی اور اپنی پاٹ دار آواز میں بولے۔

''ارے بھائی وہ آپ کے شوہرِ نامدار عابد سہیل صاحب کہاں ہیں۔ مجھ سے روپے لے گئے تھے نہ رقم واپس کی، نہ صورت دکھائی'' کہہ کر خوب زور سے ہنسے۔ اس دوران رُخسانہ صاحبہ نے بھی فون اُٹھالیا تھا۔ انہوں نے یہ بات سُن لی اور اپنے والد کے مزاحیہ جملہ کے بارے میں بار بار معذرت کرتی رہیں۔ لاری صاحب کو شاید اِس کا علم بھی نہ ہوا ہو کیوں کہ بیٹی کی آواز سنتے ہی انہوں نے فون رکھ دیا تھا۔

لطف کی بات، یہ ہے کہ یہ مذاق اُنہوں نے اس وقت کیا تھا جب اُن کی ساری رقم واپس کیے ہوئے مہینوں ہو چکے تھے۔ اہلیہ کو اِس کا علم بھی نہ تھا کیوں کہ اس قرض کا تعلق نہ گھر کی کسی ضرورت سے تھا نہ نصرت پبلشرز کے کسی کام سے۔

شام کو گھر آیا تو انیس نے سارا واقعہ لطیفہ کے طور پر سُنایا۔ میں بھی ہنستا رہا۔

■ ■

افسوس، یہ شمع بھی ۱۷رمئی ۲۰۰۴ء کو خاموش ہوگئی۔

ڈاکٹر عبدالحلیم

جولائی ۱۹۴۷ء کی کوئی تاریخ۔

ضلع غازی پور کے موضع پہتیا سے دو بیل گاڑیوں پر دس بارہ افراد غازی پور جارہے ہیں کہ دونوں مقامات کو ملانے کے لیے نہ پکّی سڑک ہے، نہ بس سروس۔ اور بیل گاڑیوں میں سوار ہیں مّمی جان، یعنی ڈاکٹر عبدالعلیم مرحوم کی اہلیہ، ان کی بہن حمیدہ اور میری والدہ عائشہ اور علیم صاحب کے سارے بچّے۔ جمیلہ، جو امریکا سے ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ بایوکمیسٹری سے متعلق ہوگئی تھیں اور اب سبکدوش ہوچکی ہیں، شمیمہ، وسیمہ، حمیدہ خالہ کے بچّے اور میرا چھوٹا بھائی عمران اور چھوٹی بہن نجمہ اور ایک نٹ کھٹ، شریر، ذرا ذرا سی بات پر رُوٹھ جانے والا خوبصورت سا پانچ چھے سال کا بچہ حلیم! چنچل، شوخ، چُپ بیٹھنا جانتا ہی نہیں۔ کبھی بڑی بہنوں کو گدگدا رہا ہے، کبھی چھوٹی بہنوں کو چٹکی کاٹ رہا ہے۔ ممّی جان ڈانٹتی ہیں تو رونے لگتا ہے' آنسوؤں سے' اور پھر آپ ہی آپ ہنس دیتا ہے، جیسے یہ سب مذاق ہو۔ رونا بھی اور ہنسنا بھی۔ تھوڑی دیر بعد پھر وہی شرارتیں، چُہلیں، چھیڑ خانی۔ ماں ڈانٹتی ہیں، خالائیں سمجھاتی ہیں۔ دو چار منٹ کے لیے خاموش ہوجاتا ہے لیکن ذرا دیر میں پھر وہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

آخر مجھ سے ضبط نہیں ہوتا۔ میں دونوں بانہوں سے اُٹھا کر حلیم کو گاڑی سے اُتار دیتا ہوں۔ ''بہت اچھا کیا، یہی سزا ہے'' ممّی جان کہتی ہیں۔ گاڑی آگے بڑھ رہی ہے، حلیم اُسی جگہ کھڑے زور زور سے رو رہے ہیں۔ میں گاڑی بان سے رفتار دھیمی کرنے کے لیے کہتا ہوں لیکن فاصلہ بہر حال بڑھتا جا رہا ہے۔ اتنے میں حلیم یکایک گاڑی کی طرف دوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں گاڑی رکوا دیتا ہوں اور حلیم کو اُٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیتا ہوں اور آنسوؤں کے دو قطرے جو اُس کی آنکھوں سے گرنے کے لیے بے چین ہو رہے ہیں پونچھ دیتا ہوں۔ حلیم مجھے دیکھتا رہتا ہے، خاموشی سے اور پھر میری گردن میں بانہیں ڈال کر مجھے پیار کر لیتا ہے۔

اس بچّے نے وہ دن اور ۳۰/اگست ۱۹۹۱ء کی رات تک، جب میں نے اُسے، جو اب ڈاکٹر عبدالحلیم کے نام سے جانا جاتا ہے، آخری بار دیکھا، حفظِ مراتب اور محبت کا رشتہ استوار رکھا۔۔۔۔ دزدیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھنا، دیکھتے ہی کھڑے ہو جانا اور اس وقت تک نہ بیٹھنا جب تک میں آنکھوں سے اشارہ نہ کر دوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ پہلے سگریٹ اور اب سگار پیتے ہیں، لیکن میرے سامنے نہیں۔ اس آخری ملاقات کے وقت حلیم بے حد بیمار تھے لیکن مجھے بیماری کی شدّت کا علم نہ تھا۔ میں انیس انصاری صاحب سے بیٹھا بات چیت کر رہا تھا کہ اتنے میں ہم دونوں نے دیکھا کہ حلیم پنڈال میں داخل ہو رہے ہیں، وھیل چیر پر۔ انیس انصاری صاحب نے جو کانپور میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز رہ چکے ہیں، مجھ سے پوچھا۔

''حلیم صاحب، اس طرح کیوں۔؟''

''علیل ہیں۔'' میں نے جواب دیا اور ہم دونوں اس جانب بڑھے، جہاں حلیم بیٹھے تھے، نوشہ کی مسند کے بالکل سامنے۔ انیس انصاری نے مزاج پرسی کی، اتنے میں حلیم کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں نے ان آنکھوں میں وہ تکلیف پڑھی جو مجھے دیکھ کر کھڑے نہ ہو پانے سے انھیں ہو رہی تھی۔ میں نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''پہلے ٹھیک ہو جاؤ جلدی سے۔ باقی باتیں بعد میں۔''

مسکرائے۔ بجھی بجھی سی مسکراہٹ۔

''ٹھیک ہو جاؤ گے، جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' میں نے تسلّی دی۔

''ریڑھ کی ہڈی میں تکلیف ہوئی۔'' اُنھوں نے کہا۔ پھر کسی بیماری کا نام لیا۔ بات کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔ خاموش ہو گئے پھر بولے۔

''ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس طرح کے لاکھوں مریضوں میں سے بس ایک مریض کی بیماری یہ شکل اختیار کرتی ہے۔''

''تم بھی تو لاکھوں میں ایک ہو۔''

مسکرائے۔ اس بار مسکراہٹ میں مایوسی کسی قدر کم تھی۔

اس دوران انیس انصاری ان سے ملاقات کر کے جا چکے تھے۔

میں نے کہا ''انصاری صاحب شاید علی گڑھ یونیورسٹی کی پیداوار ہیں۔''

خوش ہوئے۔

''انھیں معلوم ہی نہیں تھا کہ تم علیم صاحب کے بیٹے ہو۔''

''اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔'' حلیم بے حد اعتماد سے بولے۔

اُسی وقت بارات آ گئی۔ بھیڑ بھاڑ بڑھی تو میں پچھلی صف میں آ کر بیٹھ گیا۔

تقریب کے اختتام پر، رُخصت ہوتے وقت، ایک بار پھر حلیم سے ملاقات کی۔ اس دوران شاید تکان کے سبب ان کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا تھا، جسے وہ اپنی مسکراہٹ سے چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ نہ میں نے کچھ کہا نہ اُنھوں نے۔ بس دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ نہ انھیں معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے، نہ مجھے۔

کچھ اور یادیں اس طرح ہیں:-

حلیم شاید بی، اے کے طالب علم ہیں۔ جمعہ کا دن ہے، یونیورسٹی میں حسبِ معمول چھٹی

ہوگئی ہے اور وہ ۳۔ یونیورسٹی روڈ کے بنگلے میں اپنے کمرے سے نکل کر سامنے کے دالان سے ہوتے ہوئے دوسرے کمرے میں جارہے ہیں۔ اتنے میں علیم صاحب کی نظر ان پر پڑتی ہے۔

''نماز پڑھنے نہیں گئے۔؟''

''جی جارہا ہوں۔'' حلیم منمناتے ہیں۔

''نماز پڑھنا ہے تو قاعدے سے پڑھو، ورنہ نہ پڑھو۔''

حلیم خاموش کھڑے ہیں۔

''کھڑے کیا ہو۔؟''

''جی۔'' کہہ کر حلیم جلدی سے غسل خانے جاتے ہیں، وضو کرتے ہیں اور یونیورسٹی کی مسجد کی جانب روانہ ہوجاتے ہیں۔

پھر چند برس بعد وہ امریکا چلے جاتے ہیں۔ وہاں سے ڈاکٹریٹ کر کے واپس آتے ہیں۔ شادی ہوتی ہے۔ زربفت کی شیروانی میں دولھا نہیں، شہزادے معلوم ہورہے ہیں۔

دو تین سال بعد ان کی زندگی میں زہر گھلنا شروع ہوجاتا ہے جس کی شدت روز بروز بڑھتی جارہی ہے، لیکن مجال ہے جو اُن کے چہرے پر غم کے سائے کا بھی کسی کو احساس ہوسکے۔ ایک دن، کئی برسوں بعد، میں پوچھتا ہوں۔

''ماموں صاحب کی اتنی بڑی لائبریری تھی۔ ساری کتابیں کیا ہوئیں؟''

''محفوظ ہیں !''

''مطالعہ کے وقت ماموں صاحب کتابوں پر حواشی لکھتے تھے۔ اکثر کئی کئی صفحات کے نوٹس تیار کر کے اسی کتاب میں رکھ دیتے تھے۔ میں ساری کتابیں دیکھنا چاہتا ہوں، ممکن ہے ان میں کچھ اہم کاغذات ملیں۔''

''آپ نے پہلے بھی کہا۔ فرمایا تھا۔'' حلیم کہتے ہیں۔ ''میں نے ایک ایک کتاب دیکھ ڈالی۔ آپ کے کام کی کوئی چیز نہیں ملی۔''

میں جانتا ہوں کہ حلیم دروغِ مصلحت آمیز سے کام لے رہے ہیں۔ اس کا سبب بھی جانتا ہوں کہ ایسا نہ کرتے تو کسی دوسرے کی شخصیت پر آنچ آتی اور یہ انھیں کسی طرح گوارا نہیں۔ میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ اُنھیں احساس بھی نہ ہو کہ مجھے حقیقت معلوم ہے۔ لیکن وہ مجھ سے آنکھیں چار نہیں کرتے اور چند لمحوں بعد گفتگو کا رُخ بدل دیتے ہیں۔

کئی سال بعد ایک دن آتے ہیں، امتحان میں بچوں کی کامیابی پر بے حد خوش ہیں۔ دونوں کو ستر فیصدی سے زیادہ نمبر ملے ہیں۔ ایک ایک تفصیل بتاتے ہیں۔ میں مبارکباد دیتا ہوں، اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ بیٹے نے رزلٹ کارڈ دکھانے کی کوشش کی تھی تو اس کے ہاتھ سے کاغذ لے لیا گیا تھا اور انھوں نے تفصیلات اسکول جا کر معلوم کی تھیں۔ لیکن کسی قسم کا کرب یا تکلیف کا احساس ان کے چہرے پر نہیں۔ ہنس رہے ہیں۔ لطیفے سنا رہے ہیں۔ دوسروں کو اپنے بارے میں دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہیں، خود کو بھی۔ ان حالات میں کوئی خود کو بھی دھوکا نہ دے تو کیا کرے۔

حلیم کے کالج میں جگر مرادآبادی پر ایک سے مِنار ہے۔ متعدد دوسرے ادیبوں کے علاوہ علی گڑھ سے قاضی عبدالستار اور دہلی سے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی آئے ہیں۔ حلیم کے اصرار پر میں نے بھی ایک پرچہ پڑھا ہے۔ سیمنار کے بعد مہمانوں کے لیے کھانے کا انتظام ہے، لیکن اس میں ابھی تھوڑی دیر ہے۔ ہم لوگ ہال سے نکل کر میدان میں بکھر جاتے ہیں۔ کچھ طلبہ بھی ہیں، طرح طرح کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اتنے میں ایک کار آتی ہوئی نظر آتی ہے اور ہم لوگوں سے تھوڑے فاصلے پر آ کر رک جاتی ہے۔ حلیم آگے بڑھتے ہیں اور کارنشینوں سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اتفاق سے میں ٹہلتے ٹہلتے کار کے پاس سے گزرتا ہوں تو حلیم کی آواز میرے کانوں میں پڑتی ہے۔

''میں تو سب سے مستحق اُمیدوار ہی کا انتخاب کروں گا۔''

کھانے کے دوران بات چیت ہو رہی ہے۔ لطیفے بھی سنائے جا رہے ہیں۔ سیمنار میں پڑھے جانے والے پرچوں پر تبصرے ہو رہے ہیں۔ لیکن ''کارنشین'' میزبانوں کے چہروں پر تناؤ ہے۔ پھر ان میں سے ایک صاحب ٹوٹی پھوٹی اُردو میں مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور رخصت ہو جاتے ہیں۔

قاضی صاحب کو ٹرین پکڑنی ہے۔ ظہیر صاحب کو شہر میں کچھ کام ہے۔ ان دونوں کے رخصت ہو جانے کے بعد حلیم کے کمرے میں صرف میں اور وہ رہ جاتے ہیں۔

''کیا بات تھی۔ تم اس قدر سخت لہجے میں کیوں بات کر رہے تھے؟''

''کہتے ہیں لکھنؤ سے بے حد زور پڑ رہا ہے کہ فلاں اُمیدوار کو لینا ہے۔ میں تو سب سے اچھے اُمیدوار کو لوں گا۔''

''اور اگر وہی سب سے بہتر اُمیدوار نکلا تو؟''

''تو سر آنکھوں پر۔ لیکن میں سب سے اچھے اُمیدوار ہی کو لوں گا۔''

ڈیڑھ۔ دو ماہ بعد حلیم لکھنؤ آئے تو میں نے پوچھا۔

''کس کا انتخاب کیا؟''

''جو سب سے بہتر تھا۔''

''اُنہی کا جن کے لیے زور ڈالا جا رہا تھا؟''

''وہ تو سب سے کمزور اُمیدوار ثابت ہوا۔ صرف ایم اے اور وہ بھی سیکنڈ ڈویژن۔''

چند ماہ بعد حلیم کو برخاست کر دیا گیا۔ پھر کسی نے مشورہ دیا کہ پہلے معطل کیا جانا ضروری ہے۔ چنانچہ برخاست کرنے کے بعد طرح طرح کے الزامات لگا کر انھیں معطل کر دیا گیا۔ ایک طرف یہ سب کچھ ہوا اور دوسری طرف اسی میٹنگ میں پرنسپل کا بنگلہ، جس میں وہ پہلے ہی سے مقیم تھے، ان کے نام الاٹ بھی کر دیا گیا۔

کافی دنوں بعد گھر آئے اور میرا کمرہ دیکھ کر بولے۔ ''آپ کا کمرہ کسی قدر بے ترتیب ہو گیا ہے۔ بستر اور میز کرسیوں پر کتابیں نظر نہیں آ رہی ہیں۔ ساری چیزیں قرینے سے اپنی اپنی جگہوں پر رکھی ہیں۔!''

میں مسکرا دیا۔

پھر خود ہی بولے۔ ''آپ نے 'پتر کا' میں فردِ جرم پڑھی تھی؟''

میں انجان بن گیا۔

"یہ دیکھیے۔" اُنہوں نے جیب سے اخبار کا تراشہ نکال کر میری طرف بڑھادیا۔ اشتہار مَیں پہلے ہی سے پڑھ چکا تھا۔ اِدھر اُدھر سے دیکھا اور تراشہ واپس لوٹا دیا۔

"جلد ہی دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہو جائے گا۔ مقدمہ آخری اسٹیج میں ہے۔ بس بحث ہونی باقی ہے۔"

بحث ہوئی۔ دو دن تک۔ دونوں طرف کے وکیلوں نے اپنے اپنے ترکش کا آخری تیر تک استعمال کر ڈالا، فیصلہ محفوظ رکھا گیا۔ تیسرے چوتھے روز ہائی کورٹ نے سارے الزامات بے بنیاد قرار دیتے ہوئے ڈیڑھ دو سال کی ساری تنخواہ اور اخراجات کے ساتھ فیصلہ ان کے حق میں سنا دیا۔

سپریم کورٹ میں اپیل کی گئی۔ وہاں سے بھی حلیم سرفراز ہی لوٹے۔ حلیم کے مزاج، اور بات چیت کے انداز پر نہ اس فیصلے کا کوئی اثر ہوا، نہ پریشانی کے دنوں کا، نہ اس اشتہار کا جس میں ان پر غبن کے الزامات لگائے گئے تھے اور نہ اس شخص کی بے حسی کا جس کو نہ ان کی برطرفی پر افسوس تھا، نہ بحالی پر خوشی۔

کالج کے نظم و نسق کی اب مثال دی جانے لگی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امتحانات کے دوران انھوں نے دس دس طلبہ کو نقل کرتے ہوئے پکڑ کر باہر کر دیا لیکن احتجاج کی ایک بھی آواز بلند نہ ہوئی۔ صاف ستھرا کالج۔ پڑھائی کے کمروں کے باہر پھولوں کے پودے اور گملے، نہ شور نہ ہنگامہ۔

حلیم شہر کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے مرکز بن گئے ہیں۔ عالم فاضل نہیں، لیکن اقبالؔ کے کلام کے شیدائی ہیں، دوسرے شعرا کے بھی سیکڑوں اشعار یاد ہیں، جن سے اپنی تقریر کو وہ دلپذیر بنا دیتے ہیں۔

کم و بیش پونے چھ فٹ کا قد، کھلتا ہوا گندمی رنگ، دُہرا بدن، بڑی بڑی روشن آنکھیں اور خوش پوش۔ خوش گفتاری اور حاضر جوابی اس پر مستزاد۔ جہاں بھی بیٹھیں شمعِ محفل بن جاتے ہیں۔

شامیں دوستوں کے ساتھ، جن کی تعداد صرف کان پور میں ہی بلا مبالغہ سیکڑوں میں تھی، گزرتیں۔ ہمیشہ یار شاطر ہی رہتے کبھی بار خاطر نہ بنتے۔ ایک جانب دوست داریاں اور

انتظامی امور کی مصروفیات تھیں اور پرانے زخم بھرنے لگے تھے اور دوسری طرف کینسر چپکے چپکے اپنا جال جسم کے اندر بچھا رہا تھا۔ اصل مرض کا پتہ اس وقت چلا جب ڈاکٹروں کے اندازے کے مطابق۔ ''موت کا وارنٹ جاری ہو چکا ہے۔ بس اس کی تعمیل کا وقت مقرر نہیں، لیکن چالیس پنیتالیس دن تو لگیں گے ہی۔ بے حد تکلیف دہ ہوگی یہ مدت۔''

بستر پر اُٹھنا بیٹھنا تو دُور کی بات، خود سے کروٹ لینا تک مشکل ہو گیا تھا۔ انہیں احساس رہا ہوگا کہ اب وہ بارِ خاطر بنتے جا رہے ہیں اور زندگی کا یہ انداز جس میں بس سانسوں کی آمد و شد باقی تھی، انھیں نہ بھایا اور انہوں نے ڈیڑھ دو مہینوں کو ایک ہفتہ میں سمیٹ لیا۔

۲۷ رستمبر بروز جمعہ، دن کے تین بجے، دل کا پہلا دورہ پڑا اور سات بجے دوسرا۔ لیکن پوری طرح ہوش و حواس میں تھے۔ آنکھیں کھول کر ایک ایک چہرے کے نقوش ذہن میں محفوظ کر لینے کی کوشش کی، پھر الوداعی نظروں سے سب کو دیکھا اور ان بستیوں کی تلاش میں نکل پڑے جن کا نہ تو ان کو علم تھا اور نہ زندوں میں سے کسی کو ہے۔

اس وقت تو ایسا محسوس ہوا جیسے زندگی تھم سی گئی ہو، پر یہ دُنیا بڑی ظالم ہے۔ کچھ ہی دنوں میں سب کچھ معمول کے مطابق ہو جائے گا لیکن ان کے متعلقین اور دوست احباب کو جب بھی اس باغ و بہار شخصیت کی یاد آئے گی، وہ دِل مسوس کر رہ جائیں گے۔ موت کے بعد، اپنے جاننے والوں کی یادوں میں زندہ رہنے سے زیادہ کوئی کر بھی کیا سکتا ہے۔ حلیم نے زندگی کچھ اس طرح کی تھی کہ ان کی موت نے انہیں اپنے دوست احباب کے دلوں میں اور بھی زندہ کر دیا۔

نہ وہ کالج کبھی اُن کو بھولے گا، جس سے وہ متعلق تھے، نہ کالج کے طلبہ، نہ اساتذہ، نہ اُن کے دوست احباب، نہ وہ جنھوں نے ان کی زندگی میں زہر گھولا اور نہ وہ جنھوں نے اُن کے خلاف سازشوں کے جال بُنے۔ اُن کے مخالفین بھی ماضی کے آئینے میں اُن کے دِل پر گرد کی تہ تلاش کرتے رہیں گے اور اُسے صاف و شفاف پا کر ملول ہی ہوں گے، اپنی سعیٔ رائیگاں پر۔

■ ■

راجیش شرما

راجیش شرما اتر پردیش کے محکمہ اطلاعات ورابطۂ عامّہ کے جوائنٹ ڈائرکٹر، ہندی کے مشہور شاعر، اُردو شاعری کے عاشق، کالم نویس ایسے کہ خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھتے، موسیقی اور خاص طور سے کلاسیکی موسیقی کے ایسے رسیا کہ شاید ہر اچھے گانے اور غزل کے کیسیٹ ان کے پاس موجود تھے۔نوشاد کی بنائی ہوئی ایک ایک دھن اور بیگم اختر کی گائی ہوئی ایک ایک غزل انہیں یاد تھی۔افسر تھے، خاصے بڑے افسر، لیکن افسری کی خوبو نام کو نہ تھی۔خوش پوش، خود آشنا، مسرّت آشنا اور ان سب سے زیادہ غم آشنا تھے۔اپنا ہو یا دوسروں کا۔

یہ ساری خصوصیات کسی ایک شخصیت میں جمع کر دی جائیں تو ایک ہیولا سا بن جاتا ہے۔ پھر اس میں کسی قدر تیز لیکن نپی تلی چال، ہنستے ہنستے غم کے سمندر میں ڈوب جانے اور یکا یک مسکرا دینے والی آنکھیں اور.........

''ہیلو! ارے یہ آپ ہیں، بڑی رسیلی آواز ہے، بھابی صاحبہ چائے میں کیا گھول کر پلاتی ہیں؟''

ایسے جملے جوڑ دیجیے تو یہ ہیولا کچھ کچھ واضح شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔اب اس میں

الٰہ آباد کی باتیں، کرشن چند کی کہانیوں کے پلاٹ، کرداروں کے مکالمے، ان افسانوں کے موڑ، اختتام، ندا فاضلی کی نظم کے بند ''جو ہوا سو ہوا'' کی تکرار، چپراسی اور ڈرائیور تک سے ''آپ'' ''کر دیجیے'' ''آجایئے'' بھی شامل کر دیے جائیں تو اس تصویر میں مزید رنگ بھر جاتا ہے۔ لیکن ہے یہ اب بھی نامکمل۔ انہیں جاننے، سمجھنے اور پہچاننے کے لیے اس میں، خود ان کو، وہ جو اندر سے تھے، ان ساری خوشیوں کو جن کی آرزو سے وہ اپنا دل و دماغ روشن رکھتے تھے، ان تمام غموں کو جنہیں وہ چوری کے مال کی طرح چھپائے رکھتے تھے، بھی شامل کرنا ہوگا، تب کہیں جا کر ان کی تصویر مکمل ہوگی۔

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

راجیش شرما سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی بالکل یاد نہیں۔۔۔۔ کافی ہاؤس، کسی ادبی جلسہ یا پھر خود محکمۂ اطلاعات میں، کچھ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ پھر ایک، دن یکا یک احساس ہوا کہ ہم دونوں کے ادبی دوست مشترک ہیں، مدرارا کھشش، کا متاناتھ، شکیل صدیقی، راکیش، ویریندر یادو، نریش سکسینہ، لیلا دھر جگوڑی وغیرہ وغیرہ۔ پھر ایک دن جیسے انکشاف ہوا کہ سوچنے سمجھنے، چیزوں کو دیکھنے اور لوگوں کے بارے میں رائے قائم کرنے کے انداز میں بھی ہم دونوں کے درمیان بہت کچھ مشترک ہے۔ ایک دن اپنے ہی دفتر میں ایک صاحب سے میرا تعارف کرایا، ایسے الفاظ میں کہ مجھے شرمندگی ہونے لگی، فوراً سمجھ گئے اور مسکرا کر میری طرف دیکھا، بولے۔

''کیا تھوڑی دیر کے لیے اسی دفتر میں آپ کو اپنے کسی دوست سے ملنا نہیں ہے، میں اُن سے کھل کر باتیں تو کرسکوں۔''

میں نے کہا۔ ''بہت ہو چکا، اب تھوڑا سچ بھی بول دیجیے۔''

ایک دم ہنس پڑے۔ ''اچھا بھائی، یہ بہت خراب آدمی ہیں۔ بالکل پڑھے لکھے نہیں ہیں، میں اب تک جھوٹ بول رہا تھا۔ اب تو آپ باہر نہیں جائیں گے۔ چلیے اسی بات پر ایک

پیالی چائے اور سہی'' کہہ کر دفتر کے اپنے قریب ترین دوست راجیو دیکشت کی طرف دیکھا، شرارت سے مسکرائے۔

دیکشت جی کے والد میرے کلاس فیلو تھے۔ ایک دن انہوں نے یونیورسٹی کے دنوں کے چند دوستوں کی ایک چھوٹی سی تصویر دکھائی۔ میں کھجور کے ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، پاس میں راجیو کے والد تھے، دو ایک دوست اور بھی تھے۔ اسی وقت دیکشت جی اُٹھ کر کسی کام سے باہر چلے گئے۔ میں تصویر دیکھ کر عمرِ رفتہ کو آواز دینے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی لمحہ انہوں نے میری جانب کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں نے تصویر ان کی طرف بڑھا دی۔ تصویر دیکھی، مجھے دیکھا، پھر تصویر دیکھی اور بولے۔ ''تصویر ہی دیکھ کر تباہی کا نقشہ آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔''

پھر خوب ہنسے اور بولے ''اسی زمانہ کی اپنی بھی ایک تصویر دکھاؤں گا۔ اب تو لگتا ہے اس عمر میں ہمارے آپ کے ایسے سارے لوگ ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔''

وہ تصویر دکھانے کی نوبت کبھی نہیں آئی، جب اصل سامنے ہو تو تصویر کے پیچھے کون بھاگے۔ انہوں نے سوچا ہوگا۔ میں نے بھی یہی سوچ کر یاددہانی نہ کرائی ہوگی۔

''اتر پردیش'' کے سدبھاؤنا انک میں لگے تو دن رات ایک کردیے۔ کامتا ناتھ سے معلوم ہوا کہ بے حد مصروف ہیں۔ ایک آدھ بار ملاقات کرنے کا جی چاہا، لیکن ٹال گیا۔ بہت مصروف ہوں گے، یہ سوچ کر۔ پھر شاہنواز قریشی سے ایک دن پیغام ملا۔ چند کتابوں کی ضرورت تھی۔ اُن کے ایڈیشن ختم ہوئے برسوں ہوگئے تھے۔ میرے پاس اتفاق سے چاروں کتابیں تھیں۔ لے جا کر پیش کردیں۔ بہت خوش ہوئے، بولے۔

''پورے ایک مہینے سے پریشان تھا۔ کس کس سے نہیں کہا، آپ نے بڑا کام کیا۔'' یہ الفاظ اُن کے نہیں ہیں اُن کے الفاظ تو بہت گہرے تھے، بالکل دل سے نکلے ہوئے۔

سچ پوچھیے تو یہ گہری دوستی کا آغاز تھا۔ نہ جانے کیسے سارے تکلفات ختم ہو گئے، ایک بے روزگار اور ایک افسر کے درمیان کے سارے فرق مٹ گئے۔ میں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا، لیکن انہیں سب کچھ معلوم تھا، اس کے باوجود انہوں نے اس سلسلے میں کبھی کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ ایک دن میں گیا تو یہ خصوصی شمارہ شائع ہو چکا تھا۔ معلوم نہیں انہیں کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں آنے والا ہوں۔ شاید طبیعت خراب تھی، دفتر نہیں آئے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کا کمرہ بند رہتا تھا لیکن تالا کھول کر مجھے بٹھایا گیا۔ سد بھاؤنا انک دکھایا گیا، وہ صفحہ کھول کر میرے سامنے رکھ دیا گیا جس میں تعاون کے لیے میرا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ شکریہ کس چیز کا؟ میں نے کیا تعاون کیا تھا؟ کتابیں۔ سو واپس مل گئی تھیں، لکھا ایک جملہ نہیں تھا۔ ہاں مشوروں میں ضرور شامل رہا تھا، ترتیب میں بھی تھوڑا سا، بہت تھوڑا سا، تعاون دیا تھا۔۔۔۔ وہ نہیں تھے لیکن کمرہ ان کی خوشبو سے بسا ہوا تھا۔

پھر تقریباً ڈیڑھ سال بعد ایک دن اپنے گھر آنے کی دعوت دی، کچھ اس طرح کہ کسی معذرت سے کام نہ چلا۔ باتوں کا سلسلہ چلا تو پتہ ہی نہ چلا کہ کب ایک بج گیا۔ مجھے بتائے بغیر گھر فون کر دیا۔

''میرا بھی سہیل پر کچھ حق ہے ہم لوگوں کو دل بھر کے باتیں کر لینے دیجیے۔''

تھوڑی دیر بعد میرے گھر سے فون آیا تو راز کھلا۔

سجا سجایا کمرہ، ایک ایک چیز قرینے سے رکھی ہوئی۔ خاموش، کم گو بھابھی صاحبہ سے تعارف کرایا۔ بیٹی ان دنوں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کر رہی تھی، اس سے ملایا تو خوب باتیں ہوئیں۔

کمرے میں بہترین غزلوں اور گانوں کے کیسٹوں کی ایک درجن قطاریں تو ہوں گی۔ کئی غزلیں سنوائیں، دُنیا بھر کی باتیں کیں۔ رات کو شاید دو بجے یا اس کے بھی بعد کھانا کھایا گیا۔ میں بھی خوش خوراک نہیں، لیکن ان کے مقابلہ میں تو بسیار خور قرار پاؤں گا۔ دو اتنی چھوٹی چھوٹی روٹیاں کہ ان پر روٹی کی تہمت لگانا بھی مشکل ہے اور تین چار چمچے ترکاری اور بہت تھوڑا

سا نمکین دہی۔۔۔۔ یہ تھی ان کی ایک وقت کی خوراک۔

ان کا شعری مجموعہ ''جو سننا تو کہنا ضرور'' چھپ کر آیا تو ایک کاپی مجھے بھی عنایت کی۔ اندر کے پہلے صفحے پر لکھا تھا۔

''عابد سہیل کو ایک بیش قیمتی رات اور بیش قیمتی بات کے لیے، پیار سے۔ راجیش۔''

بولتے تھے بیش قیمت، لکھتے تھے بیش قیمتی، میں نے ایک دن ٹوکا تو بولے۔

''بیش قیمتی کی بات ہی اور ہے، وہ تو تمہارے ڈر سے بیش قیمت کہتا ہوں۔''

میرا اور ڈر! پیار کی بھی حد ہوتی ہے۔

بیش قیمت رات تو معلوم ہے لیکن وہ کون سی معمولی سی بات تھی راجیش جسے تمہارے حسنِ سماعت نے بیش قیمت بنا دیا تھا! کم سے کم یہ تو بتا جاتے۔ راجیش! تم سے یہ امید نہ تھی!

ایک دن فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف راجیش تھے، بغیر کسی تمہید کے بولے۔ ''کچھ معلوم ہے، دو مہینے سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

میں نے دس بجے دن سے تین بجے رات تک کی مصروفیات بتا دیں۔

''ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہارے دوست کیا کریں۔ مجھے تین بجے رات کے بعد ہی تھوڑا سا وقت دے دو۔''

پہلی بار اُنہوں نے مجھے ''تمہارے'' اور ''دے دو'' سے خطاب کیا تھا لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ جواب دیتا، ٹیلی فون خاموش ہو چکا تھا۔

ایک دن قبل شاہ نواز قریشی نے کچھ ذکر کیا تھا۔ ''شعبۂ اطلاعات میں تو کام لگے ہی رہتے ہیں، میں کہاں تک خود کو پھنساؤں اور پھر مجھے ہندی بھی نہیں آتی۔'' میں نے سوچا تھا لیکن اس فون نے یہ ساری دلیلیں بے معنی کر دی تھیں۔ میں اگلے دن گیا تو مسکرائے۔

''مجھے معلوم تھا'' انہوں نے کہا۔

کمرہ کیا تھا، میز کے علاوہ ایک ایک کونا کباڑ خانہ بنا ہوا تھا۔ پہلا احساس یہی ہوا۔ سَو فائلیں تو ضرور رہی ہوں گی، اِدھر اُدھر بکھری ہوئی۔ پھر ''پہچان۔ اتر پردیش'' کے بارے میں بتایا، خاصی تفصیل سے۔ میں ''ہوں، ہاں'' کرتا رہا، ایک آدھ تجویز بھی رکھی۔ میں نے رخصت ہونا چاہا تو ایک ایسی ذمہ داری مجھے سونپ دی جس کا میں قطعاً اہل نہیں۔ میں نے معذرت کی تو بولے۔

''اب تو فیصلہ ہو چکا ہے۔''

ہر دوسرے تیسرے دن فون کرتے اور پوچھتے۔ ''مضمون کتنا ہو گیا۔'' انیس سے بات ہوتی تو ان سے کہتے ''زیادہ کام نہ کرنے دیجیے، ان کی صحت کا خیال رکھیے۔'' کسی نہ کسی طرح تین مہینوں میں مضمون مکمل کر سکا تو ''اولڈ انڈیا کافی ہاؤس'' پر ایک چھوٹے سے مضمون کی فرمائش کر دی، جو میں نے زیادہ سے زیادہ دو دن میں لکھ دیا۔

بعد کا حصہ آپ بڑھا دیں۔'' میں نے کہا۔ ''اور کیا نامکمل تھوڑا چھاپوں گا۔'' انہوں نے کہا۔ بعد میں ایک دن بولے۔ ''اس میں کچھ جوڑا نہیں جا سکتا، ایک پورے عہد کی تصویر ہے۔'' اس کے بعد ایک ایسا توصیفی جملہ کہا کہ وہ ہوتے تو دہرا دیتا۔ اب ایسا جوہری کہاں جو حذف ریزہ کو بھی ہیرا بنا دے۔

تقریباً چھ مہینوں تک وہ اور ''پہچان۔ اتر پردیش'' ایک جان دو قالب بنے رہے۔ اس دوران جانے کن کن شہروں کے سفر کیے، نوشاد اور سردار جعفری سے لمبے لمبے انٹرویو لیے، الٰہ آباد، بنارس اور ریاست کے سارے ہی دوسرے ثقافتی مراکز کے دورے کیے، تقریباً سات آٹھ سو صفحات کے مضامین جمع کر لیے۔ چند مضامین دوبارہ لکھوائے، پھر انہیں ایڈٹ کیا۔ سیکڑوں تصویریں کھنچوائیں جن میں سے تقریباً دو درجن کا انتخاب کیا اور سارے مواد کو چار سو صفحات میں سمیٹ دیا۔ چار بار پروف پڑھے گئے، دو بار پریس کے حوالے کرنے سے قبل، دو بار اس کے

بعد۔ اب یہ سب کتابی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اسے دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ راجیش شرما میں کام کرنے کی کتنی لگن اور صلاحیت تھی۔ میرا مضمون جو اُردو کے متعلق ہے کتاب کی سب سے لمبی تحریر ہے۔ اس کا ذکر یوں ضروری ہے کہ اس سے اردو کی جانب ان کے رویّہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مضمون کا عنوان ''وہ سمندر ہے کہ جس کا نہ کوئی پاٹ لگے'' بھی انہی کا دیا ہوا ہے۔ منصوبہ اسے اُردو اور انگریزی میں شائع کرنے کا بھی تھا، اب خدا جانے اس کی نوبت کب آئے۔

ایک طرف مصروفیت کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف زندگی انہیں روز بروز، زیادہ بے مقصد، زیادہ بے معنی لگنے لگی تھی لیکن جو کام ہاتھ میں لے لیا تھا اسے پورا کیے بغیر انہیں مرنا بھی گوارا نہ تھا۔ معمول سے کچھ پہلے دفتر آئے، سارے ضروری کام نپٹائے، اپنے اسٹینو کو حضرت گنج کی ایک مخصوص دکان سے ٹوتھ پیسٹ خریدنے کے لیے بھیجا، کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے آفس پیڈ پر دو تحریریں تیار کیں، مختصر لیکن ایسی جن میں اُن کی ساری شخصیت اُبھر آئی ہے۔

''کچھ مہینوں سے مجھے زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے۔ چنانچہ میں نے اس مسلسل اوب سے رشتہ توڑ لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔....''

دوسری تحریر اپنی اہلیہ، محترمہ لیلا کے لیے تھی، بے حد مختصر۔

''میں بہت شرمندہ ہوں۔ بہت کشٹ آئے گا۔''

ڈرائیور کو بلایا۔ اپنی پرانی قیام گاہ او۔سی۔آر۔ بلڈنگ گئے۔ اسے رخصت کر دیا اور مضبوط قدموں سے ۷امنزلہ عمارت میں داخل ہوئے اور لفٹ سے اوپر، بہت اوپر جا کر چھلانگ لگا دی۔

ٹھیک اسی وقت یا دو چار منٹ آگے پیچھے رکارڈنگ کرا کے میں ریڈیو اسٹیشن کے بیرونی گیٹ کے سامنے ایک منٹ رُک کر سوچ رہا تھا کہ دائیں جاؤں یا بائیں۔ کام دونوں ہی جانب تھے۔ پھر سڑک پار کی اور ٹیمپو سے گھر لوٹ آیا۔ بہ مشکل دو گھنٹے بعد کامتا ناتھ نے بتایا۔

''راجیش شرما نہیں رہے۔''

مرنے والے کو کس نے روکا ہے؟ پھر بھی، سوچتا ہوں کہ اگر او۔سی۔آر بلڈنگ کی طرف چلا جاتا تو شاید اسی سڑک سے گزرتے ہوئے ان کی نظر مجھ پر پڑ جاتی، شاید ایک منٹ کے لیے کار رکوا لیتے، شاید میں ان کے دل کی بات جان جاتا، شاید وہ میری بات مان جاتے۔ شاید۔شاید۔لیکن انہوں نے دل میں کچھ اور ہی ٹھان رکھی تھی۔اسے کوئی ''شاید'' بدل نہ سکتا تھا۔میری کیا حیثیت ہے۔

ان کی مشہور نظم ''جو سننا تو کہنا ضرور'' کے ابتدائی چھے مصرعے یوں ہیں۔

دیکھو بھائی

جو سننا تو کہنا ضرور

ایک شبد سننا تو ایک شبد کہنا

سنتے سنتے بیت گئی زندگی

کتنی۔کتنی زندگی، حساب ہے

حساب ہے کوئی!

اور اگر آواز بھی بے معنی ہو جائے تو اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ انسان اپنی زندگی ہی کو آواز بنا دے۔۔۔۔اس کی قربانی دے کر۔۔۔۔

پھر بھی کوئی نہ سُنے تو کوئی کیا کرے!!

نسیم انہونوی

کم و بیش دو لاکھ بیس ہزار گھنٹے کام کرنے کے باوجود اگر کوئی شخص ایک موٹر کار بھی نہ خرید سکے تو اس کے کیا معنی ہوئے؟ یا تو اسے کام کرنا نہیں آتا یا یہ کہ اس کام میں مالی منفعت اتنی نہیں یا اس نے خوب خوب کمایا اور دونوں ہی ہاتھوں سے لٹایا۔ اس کے علاوہ بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی لیکن اسے کیا کہیے کہ نسیم انہونوی کے سلسلے میں ان میں سے کوئی بھی صورت درست نہیں۔ وہ اپنے کام کے ایک ایک رگ ریشے سے واقف تھے، کام بھی ایسا تھا جس میں چند ہی برسوں میں ایسے ویسے کیسے کیسے بن جاتے ہیں اور انہوں نے جو کمایا اسے دونوں ہاتھو سے لٹایا بھی نہیں۔ ساری زندگی مکروہاتِ زمانہ سے وہ کوسوں دُور رہے، عیش و عشرت کو انہوں نے پاس پھٹکنے نہ دیا اور آن بان کی زندگی تو کبھی گذاری ہی نہیں۔'' پھر بھی شدید خواہش کے باوجود وہ ایک موٹر کار بھی نہ خرید سکے۔

ذکر ہے نسیم انہونوی مرحوم کا جنھوں نے ٹھیک ساٹھ سال قبل ۱۹۲۹ء میں ایک نہایت قلیل رقم سے ''طرزِ زندگی'' نامی اپنے ہی ناول سے ایک اشاعتی ادارہ کی بنیاد ڈالی جس نے بچوں کی سیکڑوں کتابوں کے علاوہ تیرہ سو سے زیادہ کتابیں شائع کیں، گم نام لوگوں کو بامِ شہرت

تک پہنچایا۔ آندھی آئے یا طوفان بلا مبالغہ کم از کم دس گھنٹے روزانہ کام کیا اور تجارت میں معاملت کے وہ معیار قائم کیے جن کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

نسیم بک ڈپو میں ہر کام کے لیے وقت اور تاریخ مقرر تھی۔ ملازمین کو تنخواہ کی ادائیگی مہینہ کے ابتدائی دنوں میں ایک مخصوص تاریخ کو ہوتی اور پریس کے بلوں کی رقوم بھی ایک مقرّرہ تاریخ کو ادا کی جاتیں۔ یہی صورت کاغذ کے بلوں کی ادائیگی اور دوسری مدوں کی تھی۔ زمین شق ہو جائے، آسمان پھٹ پڑے، لیکن اس پروگرام میں فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ اٹھاون سال سے ماہنامہ ''سرپنچ'' اور ۴۸ سال سے ماہنامہ ''حریم'' اسی ادارہ سے شائع ہو رہے ہیں، آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کی اشاعت میں ایک دن کی بھی تاخیر ہوئی ہو۔۔۔۔۔۔ نسیم انہونوی انسان تھے یا گھڑی؟ اور گھڑی کی رفتار بھی تو سست و تیز ہو جاتی ہے، برقی گھڑیاں بجلی فیل ہو جانے سے رک جاتی ہیں اور سیل سے چلنے والی گھڑیاں بھی سیل کمزور ہو جانے پر اپنی رفتار دھیمی کر دیتی ہیں۔ یا اللہ یہ تو نے نسیم انہونوی میں کون سی مشین فٹ کر دی تھی جو رُک تو سکتی تھی، اور وہ بھی صرف ایک اور آخری بار، لیکن اپنی رفتار کم نہیں کر سکتی تھی۔

بلا شبہ نسیم انہونوی نے جو کچھ کمایا، اور وہ کچھ ایسا کم بھی نہ تھا، نسیم بک ڈپو اور کتابوں کی اشاعت اور ان کی فروخت ہی سے کمایا لیکن اگر وہ یہ دو لاکھ بیس ہزار گھنٹے کسی اور کام میں صرف کرتے، کوئی دوسرا کاروبار کرتے اور وہ سب کچھ کرنے سے احتراز نہ کرتے جو آج کی اقدار سے عاری ہوتی ہوئی دنیا میں سکّۂ رائج الوقت بن گیا ہے تو کروڑوں میں کھیلتے اور ان الزامات سے بھی محفوظ رہتے جو ان کی طرح کے ہر ناشر کا مقدّر رہیں۔

مصنّف، ناشر اور کتب فروش کتابوں کے کاروبار کے تین ایسے سرے ہیں جن میں سے ہر ایک دوسرے کا شاکی رہتا ہے۔ مصنّف نالاں رہتا ہے کہ ناشر اس کا خون چوستا ہے، ناشر پریشان رہتا ہے کہ جھوا بھر روپے خرچ کر کے کتاب چھاپی جاتی ہے اور رقم کی واپسی دس دس بیس بیس روپوں کی شکل میں چھے سے دس سال میں ہوتی ہے اور کتب فروش کے خیال میں اوّل

الذکر دونوں ہی مزے میں رہتے ہیں اور وہ نقد یا چند ماہ کے قرض پر کتابیں خرید کر لائبریریوں کے حوالے کر دیتا ہے جہاں سے بلوں کی ادائیگی سال دو سال میں بھی ہو جائے تو غنیمت جانیے۔ سچ پوچھیے تو ان میں سے کسی کی بھی شکایت بے بنیاد نہیں ہے۔ رائلٹی اوّل تو مصنف کو ملتی ہی نہیں اور اگر ملتی بھی ہے تو بقدر اشکِ بُلبُل، ناشر کتابوں کی فروخت کی سست رفتاری سے پریشان رہتا ہے اور کتب فروش ناشروں کے تقاضوں سے۔ لیکن اصل سبب پر کوئی غور نہیں کرتا۔ اُردو کتابوں کی تعدادِ اشاعت اس قدر کم اور نکاسی کی رفتار اس قدر سست ہوتی ہے کہ ننگی کیا اوڑھے کیا بچھائے؟ آخر ملیالم یا بنگالی کے ادیبوں، ناشروں اور کتب فروشوں کو اس صورتِ حال سے کیوں نہیں دوچار ہونا پڑتا، یا مغربی ممالک میں جہاں رائلٹی کی شرح دوڈھائی فی صد ہونے کے باوجود ایک کتاب کی اشاعت سے مصنّف مکان بنالیتا ہے، حالات اُردو سے بالکل مختلف کیوں ہیں؟ کتاب جب تک تیزی سے فروخت نہ ہوگی، نہ مصنّف کی شکایت دور ہوگی نہ ناشر کی، نہ کتب فروش کی۔

الزام تراشیوں کے شکار نسیم صاحب بھی تھے لیکن انہوں نے کسی الزام کا کبھی جواب نہیں دیا اور نہر کی پن چکّی کی طرح دُھن کے پورے اور کام کے پکّے بنے، ساری زندگی کرم یوگی ہونے کی مثال قائم کرتے رہے۔

کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ بونس کا طریقہ عام ہونے سے بہت پہلے سے نسیم بُک ڈپو کے ملازمین کو سال میں تیرہ مہینے کی تنخواہ ملتی تھی، ہر سال تنخواہوں میں اضافہ ہوتا تھا، عید میں کپڑے بنوائے جاتے تھے، متعدد غریب اور نادار طلبہ کی فیس ادا کی جاتی تھی، بیواؤں کے لیے مستقل مالی امداد جاری تھی، اِدارہ کے ملازمین کی لڑکیوں کی شادی کے موقع پر تنخواہ، بونس اور دوسری مراعات کے علاوہ ان کی مالی امداد بھی کی جاتی تھی اور یہ سب کچھ اس طرح ہوتا تھا کہ ایک ہاتھ کی خبر دوسرے ہاتھ کو نہ ہوتی اور نسیم صاحب رات رات بھر جاگتے، کروٹیں بدلتے اور متوقع آمدنی اور واجب الادا رقوم کے پلڑوں کو کھینچ تان کر برابر کرنے کی کوشش میں

لگے رہتے۔

نسیم انہونوی صاحب کو پہلی بار غالباً ۱۹۵۸ء میں دیکھا۔ ان دنوں کرشن چندر اکثر لکھنؤ آتے تھے۔ سورج ڈھلے وہ ''کتابی دُنیا'' آجاتے اور تھوڑی ہی دیر بعد گھڑی دیکھنا شروع کردیتے۔ اب چار منٹ رہ گئے ہیں، اب دو منٹ باقی ہیں، اب نسیم صاحب آتے ہی ہوں گے'' اور نسیم صاحب اسی لمحے پہنچ جاتے اور ''کتابی دُنیا'' کے مالک اظہر نگرامی کے ساتھ یہ لوگ چہل قدمی کے لیے نکل پڑتے۔

کرشن چندر محفلوں میں تو لیے دیے رہتے لیکن اپنے دوستوں کے ساتھ ہوتے تو جملہ بازیاں بھی کرتے۔ نسیم انہونوی صاحب کو بار بار ''سرمہ والے ادیب'' کہتے۔ نسیم صاحب نہ کبھی پلٹ کے جواب دیتے نہ ان کی بات کا بُرا مانتے۔

گندمی رنگ، چوڑی مہری کا پیجامہ، شیروانی، سر پر ٹوپی، ہاتھ میں چھڑی، چہرے پر سنجیدگی جس میں خشونت نام کو نہ ہوتی، بلکہ ایک ایسی مسکراہٹ ہوتی جسے مسکراہٹ کہنا بھی کسی قدر پُر بیانی ہوگا۔ یہ تھا نسیم صاحب کا حلیہ۔ اُس دن کے بعد سے انتقال سے چند ماہ قبل تک جب آخری ملاقات کتابوں کے قومی میلہ میں ہوئی اُن کو اسی طرح پایا۔ عمر، تفکّرات اور موت کے منڈلاتے سائے ان کے جسم اور چہرہ پر اثر انداز ضرور ہوئے تھے لیکن مجموعی طور پر ان کی شخصیت اور چہرے بشرے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

نسیم صاحب ناول نگار تھے لیکن تنقیدی کتابوں اور مضامین میں ان کی ناول نگاری کا ذکر نہیں ملتا۔ ان کے فن پر مضامین بھی نہیں لکھے گئے، نہ تعریف میں نہ تنقیص میں۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ ان کے ناول ایسے ہیں کہ انہیں نظر انداز کیا جا سکے بلکہ یہ ہے کہ بطور ناشر ان کی شخصیت اس طرح چھا گئی کہ ان کی زندگی کے اس پہلو پر کسی نے غور ہی نہیں کیا۔ ایک دوسرا ممکن سبب یہ ہے کہ نسیم صاحب ان اقدار کے پاسدار تھے جن کو اس سماج نے جس میں کامیابی سے ہم کناری

ہی سب کچھ ہے، از کارِ رفتہ بنا دیا تھا۔

انہوں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور ناول نگاری شروع کی اور زندگی کی آخری سانس تک جس دُنیا میں رہے، جن قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے، ان کا ہر ناول ان ہی اقدار کی صدائے بازگشت ہے۔ اس دوران ادب کے معیار بدل گئے، ناول نگاری ارتقا کے مدارج طے کر کے کہاں سے کہاں پہنچ گئی، مقصد ایک بڑے حلقۂ ادب میں شجرِ ممنوعہ بن گیا اور افسانوی ادب لکھنے والوں سے کم Vegetarian ہونے کی فرمائشیں کی جانے لگیں۔ ایسے میں نسیم صاحب کے ناولوں کو کون اہمیت دیتا کہ ''اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانہ میں''۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ نسیم صاحب کے ہر ناول کے کئی کئی ایڈیشن چھپے، انہیں بلا مبالغہ لاکھوں لوگوں، اور خاص طور سے خواتین نے پڑھا جب کہ ان کے حسن و قبح کے بارے میں فیصلہ کرنے والوں کے ناموں سے بھی اس تعداد کے عشرِ عشیر لوگ واقف نہ ہوں گے۔ نسیم صاحب کو کسی سرٹیفیکیٹ، کسی سند، کسی توصیف کی ضرورت نہ تھی کہ ان کے اور قاری کے درمیان براہِ راست اور زندہ تعلق قائم تھا اور کوئی تنقید، تنقیص یا توصیف نہ اس میں کمی کر سکتی تھی نہ اضافہ۔

زِندگی اس قدر تیز رفتار اور زمانہ اس قدر بے رحم ہے کہ بڑی سے بڑی شخصیت کا اُٹھ جانا سمندر میں بس چند دائرے بناتا ہے اور پھر وقت کا پانی سابقہ رفتار سے بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن نسیم صاحب اُن لوگوں کو جنہوں نے اُن کی آنکھیں دیکھی ہیں، ہمیشہ یاد رہیں گے۔ نسیم صاحب کو دُعائیں دیں گے وہ طالب علم جن کی وہ مالی اعانت کیا کرتے تھے، وہ بیوائیں جن کے کڑے کوسوں میں وہ رحمت کا فرشتہ بن کر آتے تھے، ان کے ادارہ کے وہ کارکن جن کی ہر غلطی کو، ہر کوتاہی کو وہ درگذر کر دیا کرتے تھے۔ اُن کو یاد رکھیں گے وہ ادیب جن کی رائلٹی کی رقم وہ موعودہ وقت پر ادا کرتے تھے اور وہ درجنوں، جی ہاں درجنوں ادیب، جن کو نسیم صاحب نے ادبی دُنیا سے متعارف کرایا۔ نسیم صاحب کو وہ لوگ بھی یاد رکھیں گے جنہوں نے اُن کے ناولوں کے

کرداروں کے ساتھ قہقہے لگائے، آنسو بہائے جن میں اُنہوں نے خود کو تلاش کیا اور اپنی زِندگی کی کوئی نہ کوئی ادا اُن میں پا کر فخر محسوس کیا اور ایسا نہ کر پانے پر افسردہ ہوئے۔ اُن کی وہ سیکڑوں اَن دیکھی، اَن جانی اور مونہہ بولی بہنیں اُنھیں یاد رکھیں گی، جن کے ہر غم کے موقع پر نسیم صاحب دلداری کے خطوط لکھتے تھے اور جن کی مسرّتوں کو اُن کی شگفتہ تحریر دوبالا کر دیتی تھی۔ ان کو وہ لوگ بھی یاد رکھیں گے جو اصولوں کی زندگی گذار کر آندھیوں میں چراغ جلا رہے ہیں۔ اُن کو وہ بھی یاد رکھیں گے جو تجارت کو عبادت اور خوش معاملگی کو جز وایمان سمجھتے ہیں۔

نسیم صاحب کو یاد کرے گی، یاد رکھے گی اور ان کی یاد میں زندگی بھر آنسو بہائے گی ان کی بیٹی نجم السحر جس کو سولہ برسوں سے، اس کی شادی کے بعد سے، وہ ہر روز خط لکھتے تھے، بلا مبالغہ ہر روز۔۔۔۔اور ان کے ہوش وحواس کا آخری کام بھی یہی خط تھا جو انھوں نے بستر مرگ سے املا کرایا تھا۔ اس معمول میں ایک دن کی خطا بھی نہیں ہوئی کہ قبل اس کے کہ اگلے دن کا سورج طلوع ہو، نہ ان کے ہاتھ میں جنبش تھی نہ آنکھوں میں دم۔

نسیم صاحب ایک فرد تھے لیکن ایک انجمن بھی تھے۔ نسیم صاحب ناشر تھے لیکن ایک ادیب بھی تھے۔ انہوں نے اپنی دُنیا خود بنائی تھی اور یہ دُنیا ایسی بھرپور تھی کہ کامیاب سے کامیاب زندگی گذارنے والے اس پر رشک کریں گے۔

ایسی دل کش شخصیتیں، معاملت میں چوکھے، بات کے دھنی، کام کے پکّے، باوضع اور نام ونمود سے بے نیاز افراد خدا کرے جنم لیتے رہیں کہ اے خدا تیری اس دُنیا میں روشنی کے چراغ کم سے کم ٹمٹماتے ہی رہیں۔

■ ■

اُولڈ انڈیا کافی ہاؤس

ژاں پال سارتر سے ایک بار کسی نے پوچھا کہ آپ کی وجودیت اور اس کیفے کی کھڑکی سے نظر آنے والی باہر کی دنیا میں کیا تعلّق ہے اور آپ کا فلسفہ دُنیا کو اسی طرح تو نہیں دیکھتا جیسی وہ اس کھڑکی سے نظر آتی ہے؟

''ان دونوں میں رشتہ ہے، یقیناً ہے'' سارتر نے کہا اور پھر وجودیت، جوہر پر وجود کے تقدّم اور مابعد الطبیعات کی لامعنویت پر خاصی دیر تک اظہارِ رائے کرتا رہا۔

سارتر نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کس طرح اور کن الفاظ میں کی تھی، اب قطعاً یاد نہیں۔ نہ کتاب کا نام یاد ہے جس میں اس واقعہ کے بارے میں پڑھا تھا، نہ کیفے کا، کہ اس بارے میں تفصیلات پڑھے ہوئے چالیس سال سے زائد گزر چکے ہیں۔

لکھنؤ کے اُولڈ انڈیا کافی ہاؤس کی وہ حیثیت تو شاید کبھی نہیں تھی جو پیرس کے اس کیفے کی تھی جس میں کھڑکی کے پاس کی ایک مخصوص نشست جیسے سارتر کے لیے محفوظ تھی، لیکن کچھ ایسی کم بھی نہ تھی کہ وہ شہر کے سارے ہی قابلِ ذکر دانشوروں، مفکّروں، شاعروں، ادیبوں، مصوّروں اور ایسے سیاستدانوں کا مرکز تھا جن کی سیاست کی بنیاد نظریات پر استوار تھی، کسی عہدہ

یا ذاتی فائدہ کی خواہش پر نہیں۔

کوئی ادیب یا شاعر لکھنؤ آتا اور اسے یہاں کے کسی بھی اہلِ قلم کا پتہ معلوم کرنا ہوتا تو وہ سیدھا یہیں پہنچتا کیوں کہ یہ تقریباً یقینی ہوتا کہ یہاں کسی نہ کسی ادیب سے ملاقات ہو جائے گی اور اس طرح باقی لوگوں سے بھی۔

اُن دنوں بھی شہر میں ایک سے ایک ہوٹل تھے، پیسے والوں کے ہوٹل۔۔۔۔ لیکن کافی ہاؤس بس ایک ہی تھا۔۔۔۔ اُولڈ انڈیا کافی ہاؤس۔

یہ بات غالباً ۱۹۴۹ء یا ۱۹۵۰ء کی ہے جب میں نے پہلی بار کافی ہاؤس میں قدم رکھا تھا۔ ابھی با قاعدہ طور سے یونیورسٹی پہنچنے کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن طلبہ کی تحریکوں، انجمن ترقی پسند مصنّفین کی نشستوں اور بائیں بازو کی پارٹیوں کے جلسے جلوسوں کے حوالے سے جن لوگوں کو پہچاننے لگا تھا ان میں سے چند کے نام، جو ذہن پر زور ڈالے بغیر یاد آرہے ہیں، کچھ اس طرح ہیں: پروفیسر ڈی۔ پی۔ مکھرجی، آل احمد سرور، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، سید احتشام حسین، یشپال، ڈاکٹر ویر بہادر سنگھ، ڈاکٹر زیڈ اے احمد اور ڈاکٹر عبدالعلیم، جن کو گھر سے جانتا تھا۔

ان میں سے کوئی بھی معمولی حیثیت کا مالک نہ تھا۔ ڈی۔ پی۔ مکھرجی۔ معاشیات میں بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے، یشپال اور بھگوتی چرن ورما ہندی کے چوٹی کے ناول نگار اور کہانی کار تھے۔ ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ احمد آکسفورڈ یونیورسٹی سے معاشیات میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ہونے کے علاوہ کمیونسٹ پارٹی کے قومی حیثیت کے لیڈر تھے۔ سید احتشام حسین اور آل احمد سرور نے اپنی تنقید نگاری سے کئی نسلوں کے ذہنی اُفق روشن کیے تھے، اور ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اور ڈاکٹر علیم نہ صرف برلن یونیورسٹی کے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ تھے بلکہ ان میں سے تھے جنہوں نے Hindustan Association for Central Europe اور جلسے جلوسوں کے ذریعہ ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کو جرمنی اور آس پاس کے ملکوں میں گھر گھر پہنچا دیا تھا۔ اسی مقصد

کے لیے یہ دونوں جرمن زبان میں ایک رسالہ بھی شائع کرتے رہے تھے اور ہندوستان واپس آنے کے بعد انہوں نے جے پرکاش نرائن کے ساتھ سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد بھی ڈالی تھی۔

کافی ہاؤس جانے کا سلسلہ بڑھا تو کچھ دوسرے بڑوں کو جانا۔ امرت لال ناگر جن کے ناولوں کی دھوم مچی تھی، ڈاکٹر محمد حسن جن کے مقالے ''اُردو اَدب میں رومانوی تحریک'' نے ایک بڑے نقاد کی آمد آمد کی خبر دی تھی، مشہور آرٹسٹ آر۔ این۔ بِشٹ جو بعد میں آرٹس کالج کے پرنسپل بنے، شوکت صدیقی جن کے ''تانتیا'' اور ''غمِ دل اگر نہ ہوتا'' ایسے افسانوں نے دھوم مچا رکھی تھی، مجاز اور سلام مچھلی شہری، رضیہ سجاد ظہیر، سنسکرت کے عالم کملاپتی مسرا، ریڈیو ڈرامے کی دُنیا کے مشہور ڈائرکٹر ایاز انصاری، کمال احمد صدیقی، آرٹ کے نقاد کے۔ این۔ ککڑ، جواں سال شاعر منظر سلیم، ریاست میں سگریٹ کے سب سے بڑے تاجر ہونے کے باوجود مزاجاً غیر تاجر، م۔ نسیم، شاعر منیب الرحمان، اور مشہور صحافی ودّیا ساگر، ایس۔ ایم جعفر، لکشمی کانت تواری اور صلاح الدین عثمان اور ملک کے ایک چھوٹے سے اخبار کے ایک بہت بڑے ایڈیٹر، ایم چلپت راؤ جن کے اِداریوں سے زیادہ اقوام متحدہ میں ہندوستان کے کسی بڑے سے بڑے اخبار کے حوالے نہیں دیے جاتے تھے۔

ان میں سے بیشتر اپنے اپنے حلقۂ کار میں اور ان کے باہر بھی اپنی کامرانیوں سے جانے جاتے تھے لیکن ان کا ایک حوالہ، ایک اہم حوالہ، کافی ہاؤس بھی تھا۔

معلوم نہیں کافی ہاؤس میں ایسی کیا خوبی تھی کہ ہر پڑھا لکھا شخص یا ہر وہ شخص جو خود کو پڑھا لکھا ظاہر کرنا چاہتا تھا یا سمجھتا تھا، وہاں ضرور آتا تھا۔ بید کی چوڑی چوڑی کرسیاں، دیواریں ایسی کہ جن پر دو سال سے رنگ و روغن نہ ہوا ہو، بیروں کے لباس تو وہی جو عام طور پر دوسرے ہوٹلوں میں نظر آتے ہیں۔ پگڑی پر لال کلغی بھی ہوتی، لیکن نہ پیچ و خم استوار ہوتے نہ ان بیروں کے چہروں پر وہ جھوٹی مسکراہٹیں ہوتیں جو بڑے ہوٹلوں کے بیروں کے چہروں پر نظر آتی ہیں، اور نہ وہ آرڈر لیتے وقت سر کو اس طرح جنبش دیتے اور نہ مسکراہٹ اس طرح بکھیرتے جیسے

کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ بس ساری زندگی سے اسی کا انتظار کرتے رہے ہوں۔ لیکن دو باتیں ضرور تھیں۔ ایک تو یہ کہ ایک میز کی آواز دوسری میز پر سنائی نہ دیتی تھی اور دوسرے یہ کہ منیجر کے کاونٹر پر Right of admission reserved کی چھوٹی سی تختی کے عدم استعمال کے باوجود ایسوں ویسوں کو اندر آنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی اور ان میں وہ نو دولتیے بھی شامل تھے جن کی کھیپ بس انہی دنوں تیار ہونا شروع ہوئی تھی اور جن کا خیال تھا کہ دُنیا کی ہر چیز خریدی جاسکتی ہے، بس جیب میں پیسے ہونے چاہئیں۔ لیکن اس کے باوجود جانے کیا تھا کہ اس کافی ہاؤس میں داخل ہونے کا حق وہ نہیں خرید پاتے تھے۔

کافی ہاؤس کے داہنے ہاتھ پر سڑک کی جانب برآمدے میں کھلنے والی کونے کی کھڑکی کے پاس کی میز جیسے بڑوں کے لیے محفوظ تھی۔ یشپال آتے تو اسی میز کا رخ کرتے، بھگوتی بابو، ڈاکٹر علیم، آل احمد سرور، اور کبھی کبھی آنے والوں میں رام منوہر لوہیا، ڈی پی مکھر جی اور یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے اپنی ''نیک نامیوں'' سے پہچانے جانے والے کالی پرشاد بھی اسی میز کے گرد کی کرسیوں پر بیٹھتے۔

سنا ہے پنڈت نہرو، کے۔ڈی۔ مالویہ، رفیع احمد قدوائی، اندر کمار گجرال، کیسکر وغیرہ بھی ملک کی آزادی سے پہلے کبھی کبھی یہاں آتے تھے، جدوجہد آزادی کے دنوں میں، چند لمحے سکون کے گزارنے کے لیے، اور ڈاکٹر علیم کے ساتھ New Indian Literature کے ایڈیٹر ملک راج آنند اور Twilight in Delhi کے مصنف احمد علی بھی۔ وہ کن کرسیوں پر بیٹھتے تھے، یہ تو نہیں معلوم لیکن دل یہی کہتا ہے کہ اس میز اور ان کرسیوں کی بڑے لوگوں سے شناسائی پرانی ہے۔

یہ کرسیاں، یہ میز اور کافی ہاؤس کا یہ کونا عالمی سیاست اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی کیسی کیسی کہانیوں، کیسے کیسے تاریخ ساز فیصلوں کا خاموش گواہ ہے، اس کا علم تو اُسی وقت ممکن ہے جب اُنہیں زبان مل جائے اور یہ ہونے سے رہا۔ تاہم اس قدر تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا

ہے کہ ''ہفت روزہ ہندستان'' اور بعد میں ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کے نیشنل ہیرالڈ، قومی آواز اور نوجیون کی داغ بیل ڈالنے کے منصوبے اور ان اخبارات کے امکانات پر غور وخوض اس میز اور اس کے اطراف کی کرسیوں پر ضرور ہوا ہوگا۔

یہاں اَدب کے مسائل بھی زیرِ بحث آتے، یشپال، بھگوتی چرن ورما اور حیات اللہ انصاری کے ناولوں اور افسانوں اور مجاز کی نظموں اور غزلوں کے تذکرے بھی ہوتے، انجمن ترقی پسند مصنّفین اور لیکھک سنگھ کے جلسوں میں پڑھی جانے والی چیزوں پر بات چیت بھی ہوتی، لیکن بس ''سوال آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ''۔

آزادی کے بعد شہر میں کسانوں کے پہلے زبردست جلوس کی قیادت ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے کی اور کونسل ہاؤس کے سامنے جمِ غفیر کو خطاب کرنے کے بعد پیدل چل کر کافی ہاؤس آگئے، بالکل اس طرح جیسے حضرت گنج کا ایک چکّر لگا کر آئے ہوں، اور دانش وروں کی میز کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ یشپال اور ڈاکٹر علیم نے خاموش نگاہوں سے ان کا استقبال کیا اور ایاز انصاری نے جو عمر کے اعتبار سے وہاں موجود لوگوں میں شاید سب سے چھوٹے تھے، ہاتھ بڑھا کر ایک کرسی کھینچ لی تو وہ اس پر بیٹھ گئے۔

پنڈت آنند ملاّ آتے تو کبھی نوجوانوں میں بیٹھ جاتے اور کبھی ہم عمروں میں۔ چوڑی مہری کا پاجامہ اور سفید شیروانی ان کے سرخ سپید رنگ پر بڑی بھلی لگتی۔ خوب باتیں کرتے، خوب باتیں سنتے، لیکن چابی کا ایک چھوٹا سا گچھا جس میں بس دو چار ہی چابیاں ہوتیں، ان کی شہادت کی انگلی میں ہر وقت چکّر لگا تا رہتا۔

کاونٹر کے پاس یا ہال کے درمیان والے کھمبے سے ملحق میز پر شوکت صدیقی، منظؔر سلیم کمالؔ احمد صدیقی، کے این۔ ککڑ، سداسرن مسرا، مجاز، سلاؔم مچھلی شہری، بِشٹ اور نو واردان بساطِ ہوائے دل میں مجید پرویز، بی این کاچر، عثمان غنی اور غوث انصاری بھی کبھی کبھی نظر آجاتے، جنہوں نے کسی سینیر اَدیب کے سہارے کافی ہاؤس میں داخل ہونے کا حق حاصل کرلیا تھا۔

ایسے ہی نوجوانوں میں مَیں بھی تھا۔

مجازؔ خاموش ہیں، گم سم، کہ انہوں نے بہت دنوں سے کچھ نہیں کہا ہے، سلامؔ ان دنوں ادیبوں اور شاعروں کے نام منظوم خطوط لکھ رہے ہیں، ان کی صحت خراب ہے، اُداس اُداس سے بیٹھے ہیں، کوئی صحت کے بارے میں پوچھتا ہے، تو کہتے ہیں ''موت سے نہیں ڈرتا۔ بس ''نقوش'' میں اپنی نظم دیکھ لوں تو آخری سانس۔۔۔۔'' کوئی ٹوک دیتا ہے تو جملہ پورا نہیں کرتے لیکن سناٹا اور گہرا ہو جاتا ہے۔ اتنے میں ایک خاصے مشہور شاعر جو پاس ہی کے ایک بڑے شہر میں رہتے ہیں، کرسی کھینچ کر مجازؔ کے پاس بیٹھ جاتے ہیں، خاموش اور کسی قدر اُداس سے۔ مجازؔ خاموشی اور اُداسی کی برف توڑنے کے لیے اُن سے پوچھتے ہیں۔

''بھائی ایسی بھی کیا اُداسی؟''

وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں اور پھر نہایت دھیمے لہجہ میں کہتے ہیں۔

''سوچتا ہوں دوسری شادی کرلوں''

''بہت اچھا خیال ہے، لیکن اس میں اُداس ہونے کی کیا بات ہے؟''

''سوچتا ہوں کسی بیوہ سے ہی شادی کروں!''

''تو اس میں کیا پریشانی ہے، شادی کرلو، بیوہ تو ہو ہی جائے گی''

کسی نے قہقہہ نہیں لگایا کہ یہ اُولڈ انڈیا کافی ہاؤس ہے، لیکن ہر چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ سناٹا جو چاقو کے کاٹے بھی نہ کٹتا تھا، ذرا کی ذرا میں غائب ہو گیا۔

سرخ سپید، دبلے پتلے، کپڑوں کی طرف سے بے پروا، بے حد ذہین لیکن زمانے کے ستائے ہوئے شیو پوری ان دنوں کافی ہاؤس کم ہی آتے ہیں، حضرت گنج کے فٹ پاتھوں کے چکّر زیادہ چکر لگاتے ہیں، لیکن جب بھی ادھر کا رخ کرتے ہیں، میز پر اکیلے بیٹھنا انہیں ایک منٹ نصیب نہیں ہوتا۔ نہ جانے کہاں سے ایک ایک کر کے نوجوان، ادیب، شاعر، آرٹسٹ اور

ذہین طلبہ ان کو گھیر لیتے ہیں، اُن کے تیکھے اور دو ٹوک جملے، واقعات اور افراد پر ان کا تبصرہ سننے کے لیے۔

پنڈت نہرو کا انتقال ہوا تو برسوں بعد یا شاید پہلی بار کافی ہاؤس بند ہوا۔ کچھ اَدیب اور شاعر اور سیاست داں، جن میں ان کے مخالف بھی شامل تھے، حضرت گنج کی ویران سڑکوں پر ٹہلتے رہے، اُداس، فکر مند اور متوحش۔ مے فیئر (ہائے یہ سینما گھر جو ایک اِدارہ بھی تھا، اب بند ہو چکا ہے) کے سامنے کے فٹ پاتھ پر چند جان پہچان کے لوگوں کے بکھرے بکھرے مجمع میں شیو پوری یکا یک کہتے ہیں۔

''اب لاکھوں کے جلسوں کا زمانہ گیا۔ شہروں شہروں سے لوگ اکٹھا کر کے لے آئے جائیں تو بات دوسری ہے۔''

شیو پوری کتنی دور تک دیکھ سکتے تھے اس کا اندازہ اب ہوتا ہے۔ جب بڑے سے بڑے لیڈر کو بیس پچیس ہزار سے زیادہ سننے والے نہیں ملتے لیکن چھوٹے لیڈر اور ان کے کارندے شہر شہر، قصبہ قصبہ سے سَو سَو، دو دو سَو لوگوں کو لا کر لاکھوں کی ریلیاں کرتے ہیں۔

کافی ہاؤس آنے والوں کو فلموں سے عام طور سے کوئی خاص دلچسپی نہیں، ہاں غالب، اکبرِ اعظم، ہاؤ گرین واز مائی ویلی، (How Green was may valley) مائی فیئر لیڈی (My Fair Lady) وار اینڈ پیس (War and peace) اور داگرے فلینل سوٹ (The Grey Flannel Suit) وغیرہ دیکھنے سے شاید ہی کوئی خود کو باز رکھ سکا ہو۔ پائنیر نے ایک فلمی ہفت روزہ حال ہی میں جاری کیا ہے۔ نام ہے ''فلم میل'' اور ڈاکٹر محمد حسن جو کہتے تو خود کو سب ایڈیٹر ہیں لیکن ہیں اس کے ایڈیٹر، ایک نئے رخ سے سامنے آتے ہیں، سوالات کے صفحوں پر ان کے جوابات کے ذریعے، اور اس طرح یہ فلمی رسالہ بھی چپکے سے کافی ہاؤس میں داخل ہو جاتا ہے۔

سوال ہے ''گوپ کا جوڑا کون ہے؟''

''گوپ خود ہی جوڑا ہے''۔ جواب طرح طرح سے دہرایا جاتا ہے، انگریزی میں بھی، اُردو میں بھی۔

ایک اور سوال ہے ''شاعروں کے بال بڑے بڑے کیوں ہوتے ہیں؟''

''باربر شاعری سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے''

شاعر تو اپنے سر کے بال چھوٹے نہیں کراتے لیکن اُن کی ''آوارگی'' ضرور کم ہو جاتی ہے یا شاید اس جواب کے پس منظر میں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے۔

ڈاکٹر علیم، ان کے بعد سرور صاحب اور پھر ڈی۔ پی۔ مکھر جی کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چلے جانے سے دوسری صف کے کچھ لوگ یکا یک بڑوں میں شامل ہو جاتے ہیں، لیکن یشپال اور بھگوتی چرن ورما کا دم غنیمت ہے۔ نوجوان انہیں گھیرے رہتے ہیں۔ یشپال کی آواز ذرا بھاری ہے، اونچی بھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ دوسری میز تک پہنچ سکے یا پھر کافی ہاؤس کے آداب اسے بیچ ہی میں روک لیتے ہیں۔ وہ کمیونسٹ ہیں، مادری زبان نہ سہی، ان کی پہلی زبان ضرور اُردو ہے، لیکن سخت اُردو دشمن ہیں اور اسی لیے مہاپنڈت راہل سنکرتائن کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی سے نکالے گئے تھے۔ راہل جی نے تو فوراً معافی مانگ کر دوبارہ رکنیت حاصل کر لی تھی لیکن یشپال جی کو یہ تسلیم کرنے میں کہ اُردو کو بھی اتر پردیش میں زندہ رہنے کا حق ہے، برسوں لگ گئے۔ تشدّد کے ذریعہ ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں بھگت سنگھ کے ساتھ برسوں رہ چکے ہیں، بم بنا لیتے ہیں لیکن مزاج میں نرمی ہے۔ اُردو کی مخالفت کرتے رہتے ہیں لیکن فرقہ پرستی سے کوسوں دور ہیں۔

ایک دن کافی ہاؤس میں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ گھر جانے کے لیے اُٹھے تو کئی لوگ ساتھ ہو گئے۔ برآمدے سے ہوتے ہوئے اُس مقام تک جہاں اب ایک اور کافی ہاؤس ہے پہنچے تو سامنے سڑک پر ایک بارات جا رہی تھی۔ باجا گاجا، کاریں ہی کاریں، دولھا کے

گھوڑے کے سامنے بھنگڑا ناچتے ہوئے درجنوں نوجوان، کندھوں پر ہنڈے اُٹھائے ہوئے پھٹے پرانے لیتے لگائے ہوؤں کی قطاریں۔ کھڑے ہو گئے۔ باقی لوگ بھی ٹھہر گئے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔

بارات گزر گئی تو یشپال جی یکا یک بول اٹھے۔

''ہمیں اب بھی نہ معلوم ہو سکا کہ کس بھکوے کی بارات تھی''

ایک زوردار قہقہہ فضا میں بکھر گیا۔ یہ کافی ہاؤس نہ تھا۔

بھگوتی بابو کے مونہہ کا پان انہیں زیادہ بولنے نہیں دیتا لیکن ان کا ایک جملہ اور ایک واقعہ بار بار دہرایا جاتا ہے۔ جب بھی کوئی بڑی بات ہوتی، کسی چھوٹے سے ملک کی خانہ جنگی کوئی فیصلہ کن موڑ لیتی، یا کوئی بڑا ملک کسی چھوٹے سے ملک کو دبوچنے کی کوشش کرتا یا کچھ بھی ایسا ہوتا جو اخباروں کی شاہ سرخی بن سکے، تو وہ اپنے مونہہ میں پان گھماتے ہوئے گول گول آواز میں کہتے۔

''میں نے کہا تھا نا کہ یہی ہوگا''

انہوں نے یہ بات ضروری کہی ہوگی لیکن کسی دوسرے سے۔ پھر بھی کوئی ان کی تردید نہیں کرتا، ظاہر بھی نہیں ہونے دیتا کہ یہ بات اس سے نہیں کہی گئی تھی۔

ایک دن موڈ میں تھے۔ چند روز قبل یشپال جی کا نیا ناول آیا تھا۔ بولے

''یشپال، یہ تمہیں ہر ناول میں ایک کمیونسٹ کہاں سے مل جاتا ہے؟''

''وہیں سے'' یشپال نے کہا ''جہاں موجود ہونے کے باوجود وہ تمہیں نظر نہیں آتا''

اس وقت میز پر جتنے بھی لوگ تھے ان میں سے بیشتر کمیونسٹ یا قریب قریب کمیونسٹ تھے ــــ یشپال کا داماد سدرشن، عثمان غنی، احمد جمال پاشا اور کئی دوسرے۔ لیکن ہنستا کوئی نہیں۔ بڑوں کی باتیں بڑے ہی جانیں۔

یشپال جی اُردو کو ترچھی نظر سے ضرور دیکھتے تھے لیکن اپنے فرقہ کی توہّم پرستی اور فرقہ واریت کے خلاف اُنھوں نے جیسا اور جتنا لکھا، احیا پرستی کا جس بے جگری سے مقابلہ کیا، افسوس

اُردو میں کوئی بھی ایسا نہیں جسے ان کے مقابل تو دُور کی بات، آس پاس بھی کھڑا کیا جا سکے۔

بھگوتی بابو اور یشپال ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ امرت لال ناگر کے ناول ''یہ کوٹھے والیاں'' اور ''بوند اور سمندر'' اور شری لال شکل کا ''راگ درباری'' ترجمہ ہو کر اُردو والوں کو بھی پڑھنے کو ملا۔ ان ہی دنوں راولپنڈی سازش کیس سے نجات پا کر ہندوستان آنے کے بعد سجاد ظہیر انجمن ترقی پسند مصنّفین کو دوبارہ منظّم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ کچھ جلسے بھی ہوئے، بڑے بڑے منصوبے بنائے گئے لیکن ۔۔۔۔۔ ڈھاک کے وہی تین پات۔

سجّاد ظہیر کافی ہاؤس آتے تو اُردو، ہندی کے بڑے چھوٹے ادیب اور شاعر ۔۔۔ اور اب بڑے ادیب رہ ہی کہاں گئے تھے ۔۔۔ ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ گورا چٹّا رنگ، لمبا قد، صاف ستھرے کپڑے، فراقؔ کے مطابق شخصیت کی کشش میں پنڈت نہرو سے بھی آگے ۔۔۔ رام لعل، رتن سنگھ، اقبال مجید، راجیش شرما، عابد سہیل وغیرہ ان کے انتظار میں رہتے۔ ایک دن جینز میں نظر آئے تو منظر سلیم نے کہا

''بنّنے بھائی آپ اور جینز؟''

''کمیونسٹوں کو وقت کے پیچھے نہیں رہنا چاہیے'' اُنھوں نے کہا

لیکن جانے کیا ہوا کہ کمیونسٹ جو وقت سے آگے رہتے تھے، وقت کے آگے سوچتے تھے، دھیرے دھیرے، بہت پیچھے ہو گئے۔

ایک بار بہت دنوں، بلکہ مہینوں بعد، دہلی سے آئے تو عابد سہیل ایک معاملے میں اپنی شرمندگی کے بوجھ سے لدے ہوئے ان سے ملاقات کرنے وزیر حسن روڈ کے لیے نکل کھڑے ہوئے لیکن ملاقات کافی ہاؤس کے سامنے ہی ہو گئی۔ ہاتھ پکڑ کر کافی ہاؤس لے گئے، کافی منگائی، پٹیٹو چاپ بھی۔ عابد سہیل اس انتظار میں ان کے چہرے کی طرف دیکھتے رہے کہ شاید خفگی کا اظہار کریں لیکن ان کے چہرے پر ایک مسکراہٹ کھیلتی رہی۔

آخر عابد سہیل نے خود ہی ہمّت کی۔ ''آپ کا خط ملا تھا، جانے کیسے جواب دینے

میں دیر ہوگئی۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس تاخیر کا سبب کیا لکھوں کہ آپ کا دوسرا خط آ گیا۔ اب تو میں شرمندگی میں ڈوب گیا اور خط لکھنے کی جو تھوڑی سی ہمت رہ گئی تھی وہ بھی ختم ہوگئی''

''میرا کارڈ ملا تھا؟'' انہوں نے پوچھا

عابد سہیل مسکرا دیے

یہ تیسرا خط مختصر، بے حد مختصر تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ مجھے اب تک یاد ہے۔

''پیارے سہیل

محبت ایک ایسا نازک پودا ہے جسے مسلسل آبیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔

تمہارا

بنّے''

حیات اللہ انصاری کے ناول ''لہو کے پھول'' کا انتظار ایک عرصہ سے تھا۔ آخر چھپ کر آ ہی گیا۔ تین ہزار سے زائد صفحات کو محیط یہ ناول، پانچ جلدوں میں ہے۔ اندازہ ہوا کہ ایک بڑا ناول اُردو کو نصیب ہوا ہے ''شکستہ کنگورے'' موزوں کا کارخانہ'' اور ''شکر گزار آنکھیں'' ایسے افسانوں کے خالق کے اس ناول نے ان سارے مقامات پر فن کی بلندیوں کو چھولیا ہے جہاں مصنف نے اپنے سیاسی نظریات کو ذرا سا آرام کرنے کی مہلت دی ہے۔

کافی ہاؤس میں بھی عام رائے یہی ہے۔

ایک دن کافی ہاؤس کچھ مختلف سا محسوس ہوا۔ ایک میز کی بہت زیادہ جگہ گھیر نے والی بید کی آرام دہ کرسیوں کے بجائے نئی طرز کی کرسیاں پہلے ہی آ چکی تھیں، آج ایسا لگا کہ کئی میزوں کے چاروں طرف نئی کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ یہ تو ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا۔ مستقل آنے والوں میں راجیش شرما، آغا سہیل، حسن عابد، عارف نقوی، بِشٹ کے چھوٹے بھائی پی۔سی۔ بِشٹ، جو اسم با مسمّٰی ہیں، کا اضافہ ہوگیا۔ قیصر تمکین بھی جو قومی آواز سے جست لگا کر

یکا یک پائنیر پہنچ گئے ہیں، دفتر سے اکثر آ جاتے ہیں۔ دو چار دن تو ان نئی کرسیوں سے اجنبیت کی بو آتی رہی پھر سب کچھ پہلے کی طرح ہو گیا۔

جمیلا، بلیک پرنس جمیلا، کے بارے میں مشہور تھا کہ اپنے سامنے کافی ہاؤس کھلواتے ہیں اور رات گئے بند کرا کے گھر جاتے ہیں، لیکن ایک بات اور بھی تھی۔ ہر روز سو روپے کا ہرا نوٹ لے کر آتے، دوستوں کو کافی پلاتے، پٹیٹو چپس کھلاتے، حضرت گنج کے دو چار چکّر بھی لگا آتے، رکشہ پر کسی کو ساتھ لے کر کارلٹن چلے جاتے، ویلز لی یا کسی اور کے ساتھ بلیرڈ کھیلتے، کچھ اس طرح کہ گیند کی منزل اور ان کے ارادہ کے درمیان کوئی تعلق نہ ہوتا، کسی ہم مشرب کے ساتھ بار کا چکّر بھی لگا آتے لیکن رات گئے گھر واپس جانے کا وقت ہوتا تو کسی دوست سے کہتے
"یار دو روپے تو دینا، کرایہ کے لیے پیسے نہیں رہ گئے ہیں"
یہ وہ زمانہ تھا جب دو روپوں سے کم میں حضرت گنج سے لال باغ، قیصر باغ، امین آباد اور مولوی گنج ہوتے ہوئے رکشہ سے ندان محل روڈ جایا جا سکتا تھا۔

اور سدا سرن مسرا۔۔۔ اسٹیٹ بینک آف انڈیا میں ملازم تھے۔ دو دو دن کسی اطلاع کے بغیر دفتر سے غائب رہتے لیکن کچھ تو شخصیت کی موہنی اور کچھ اپنے کام میں چوکھے ہونے کی وجہ سے بات کبھی زبانی تنبیہ سے آگے نہ بڑھتی۔ آگے بیل نہ پیچھے پگہا۔ کوئی دوست اصرار کرتا تو ہفتہ دس دن اس کے یہاں ٹھہر جاتے۔ روزانہ نہ سہی تو ہر دوسرے تیسرے دن اپنے گھر سے ایک جوڑا کپڑا لے آتے اور طبیعت اُوب جاتی تو کچھ کہے سنے بغیر کسی اور دوست کے یا اپنے گھر چلے جاتے۔ میلے کپڑے اُسی گھر میں چھوڑ آتے۔ کوئی یاد دلاتا تو کہتے "ہاں، ہاں کسی دن آ کر لے جاؤں گا" پھر کہتے "اماں وہ کپڑے تو میلے ہیں، لانڈری میں دے دو اور رسید مجھے"۔
کپڑے لانڈری میں دے دیے جاتے اور رسید اُن کے پاس سے کھو جاتی ہے۔ چنانچہ کبھی کبھار تو صاف ستھرے کپڑوں میں نظر آتے لیکن زیادہ تر یونہی سے، بلکہ کسی قدر میلے

کپڑوں میں۔ لیکن اُن کی مسکراہٹ، لطیفوں اور دلداری نے اُنھیں بے حد پیاری شخصیت بنا دیا ہے، کپڑوں کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں جاتا۔

پھر ایک دن کسی نے کہا ''سداسرن''

''کیا ہوا سداسرن کو؟''

آنسو، اور آنسو، کچھ اور آنسو۔

بہت دنوں بعد معلوم ہوا سداسرن اپنی تنخواہ کا ایک بڑا حصّہ غریب لڑکیوں کی تعلیم پر خرچ کرتے تھے۔ دفتر سے قرض لے کر کئی بے سہارا لڑکیوں کی شادیاں کرا چکے تھے۔ تو یہ تھا چہرہ کی چمک، نفسِ مطمئنہ اور جاڑوں میں کرتے، پیجامے، چپل اور معمولی سے سوئٹر میں کافی ہاؤس آنے کا راز!

اب کافی ہاؤس کی دنیا بدل چکی ہے۔ سارے چراغ ایک ایک کر کے بچھڑ چکے ہیں، بجیلا چند مہینوں تک نیشنل ہیرالڈ میں کام کرنے کے بعد دہلی چلے گئے ہیں، منظر سلیم تاشقند، سداسرن مرا وہاں جہاں سے کوئی لوٹ کے نہیں آتا، یشپال اور بھگوتی چرن اپنے ناولوں اور کہانیوں کو اپنی جانشینی کے لیے چھوڑ گئے ہیں اور مجاز، بڑی شاعری کے سارے امکانات ختم کر کے وہاں جا بسے ہیں جہاں ایک شعر بھی نہ کہہ سکیں گے، سلام مچھلی شہری کا تبادلہ دہلی ہو چکا ہے، ایاز انصاری رٹائر، اولڈ انڈیا کافی ہاؤس کو کافی بورڈ کب کا بند کر چکا ہے اور اب اسے ایک کو آپریٹو سوسائٹی چلا رہی ہے۔ ملازمین کی تنخواہیں ہر ماہ ادا ہوتی ہیں، وہ قرض بھی ادا ہونا ہے جو اسے زندہ رکھنے کے لیے لیا گیا تھا۔ اب پہلے والا ایک بھی بید کا صوفہ نظر نہیں آتا، Right of Admision Reseved کی چھوٹی سی تختی پہلے کی طرح اب بھی رکھی ہوئی ہے۔۔۔۔ ہر کس و ناکس کے کافی ہاؤس میں داخل ہونے کی ہمّت نہ کر پانے کا سبب نہ یہ تختی پہلے کبھی تھی اور نہ اب اس کی بے رنگ و روغن، خود کو مونہہ چڑاتی صورت، کسی کو داخل ہونے کی دعوت دیتی ہے۔

پرانوں میں سے چند، جیسے سید محمد جعفر، وِدّیا ساگر، مدرار اکشش اور کچھ دوسرے اَدیب و شاعر دو چار مہینوں میں، پرانی یادوں کو تازہ کرنے، اِدھر آ نکلتے ہیں، کافی پیتے ہیں کوئی شناسا مل جاتا ہے تو دس بیس منٹ بے دلی سے باتیں کرتے ہیں اور رخصت ہو جاتے ہیں۔

اور پھر ایک دن یہ شمع جو ایک عرصہ سے جھلملا رہی تھی بجھ گئی۔

ے فیر پکچر ہاؤس، ایسوسی ایٹیڈ جرنلس کے تینوں اخبار۔۔۔قومی آواز، نیشنل ہیرالڈ اور نوجیون۔۔۔اولڈ انڈیا کافی ہاؤس اور برٹش لائبریری، محض سینما گھر، اخبارات، ایسی چھت جس کے تلے بیٹھ کر کافی پی جا سکے اور لائبریری نہ تھے بلکہ ایسے علمی، اَدبی اور ثقافتی ادارے تھے جنھوں نے کئی نسلوں کو علم و ادب، حسن و صداقت سے آشنا کیا تھا، انھیں زندگی بسر کرنے کے آداب سکھائے تھے۔ یکے بعد دیگرے، شہر کے منظر نامے سے ان کے غائب ہو جانے نے جو خلا پیدا کر دیا ہے اس کا پُر ہونا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔۔۔۔کم سے کم اس وقت تک جب تک وہ آنکھیں روشن ہیں جنھوں نے اُنھیں دیکھا اور برتا ہے۔

یکایک حکومت کو جانے کیا سوجھی کہ کافی ہاؤس کو حیاتِ نو بخشنے کا اس نے فیصلہ کر لیا۔ ایک وزیر باتدبیر نے اس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ وہ یہاں بیٹھا کرتے تھے تو ان لوگوں نے جو پرانی یادوں کو اپنے دِلوں میں سجائے صرف تماشا دیکھنے کی خاطر اس موقع پر موجود تھے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

سوال اُن کی آنکھوں میں ایک ہی تھا!

''کیا تم نے اُن کو کبھی یہاں دیکھا تھا؟

پطرس بخاری نے لاہور کے چاروں طرف لاہور کیا بسایا کہ ہر دوسرے شہر کے دل

میں یہی کچھ کر دکھانے کی للک پیدا ہو گئی۔ ان میں لکھنؤ بھی شامل ہے اور اب اس کے چاروں طرف لکھنؤ ہی بستا ہے۔ پہلے ایک جانب شہر چوک سے کچھ آگے ختم ہو جاتا تھا، دوسری جانب رائے داس مندر سے تھوڑا آگے، تیسری جانب گورنمنٹ ہاؤس سے بس ایک، ڈیڑھ میل آگے اور نشاط گنج کا ریلوے اسٹیشن اور چھوٹے امام باڑے سے کچھ آگے شہر کی سرحدیں نہیں تو قریب قریب آخری پڑاؤ ضرور تھے۔ اب آدھے سے زیادہ شہر ان حدوں کے باہر بستا ہے۔ کوئی ادیب گومتی نگر میں رہتا ہے تو کوئی اندرا نگر میں، کوئی انجینئرنگ کالج کے آس پاس تو کوئی اس سے بھی آگے۔ فاصلے بے پناہ اور انھیں ایک دوسرے سے ملانے والی سواریاں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور اور وہ بھی ایسی کہ جس کو ہو جان و دل عزیز۔۔۔۔ والا معاملہ ہے۔

ایسے میں کافی ہاؤس۔۔۔ جیسا بھی وہ اب رہ گیا ہے۔۔۔ شاعروں، افسانہ نگاروں، دانش وروں، صحافیوں اور فن کاروں سے آباد ہو تو کیسے اور کیوں؟ کہ اب نہ علم و ادب کی وہ زندہ تصویریں ہیں جنھیں دیکھ کر آنکھیں روشن اور دل شاد ہو جاتے تھے اور نہ سداسرن، بجیلا، م۔ نسیم اور شیو پوری ایسے دیوانے جن پر ہزار فرزانگیاں قربان تھیں۔

شاعروں ادیبوں اور مصوّروں سے لکھنؤ آج بھی خالی نہیں لیکن علم و ادب اب عبادت نہیں رہ گئے ہیں، ذریعۂ معاش اور اعزازات و انعامات کے حصول کا وسیلہ بن گئے ہیں۔ ایسے میں کوئی انور ندیم، کوئی عرفان صدیقی، کوئی بشیشر پردیپ اور کوئی عنبر بہرائچی ایسے اجتماعات اور جلسہ گاہوں میں کیوں جائے جہاں اُصولوں، نظریات اور اقدار کے بجائے انسانوں کو تولنے کے پیمانے بینک بیلینس، قیمتی ملبوسات اور کاریں ہوں۔

کافی ہاؤس نام کو موجود اب بھی ہے، اپنی شکست کی آواز بنا ہوا۔

■ ■

عابد سہیل کی کتابیں

۱۔	اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل	اتر پردیش اردو اکادمی
۲۔	سب سے چھوٹا غم (افسانے)	دو ایڈیشن
۳۔	باغات	ترجمہ برائے نیشنل بک ٹرسٹ
۴۔	ہندوستان کے پھل	ترجمہ برائے نیشنل بک ٹرسٹ
۵۔	انتخاب مضامین احمد جمال پاشا	اتر پردیش اردو اکادمی
۶۔	جینے والے	(افسانے)
۷۔	فکشن کی تنقید: چند مباحث	دو ایڈیشن

اشاعت کے منتظر مسوّدات

۱۔	سوا نیزہ پر سورج	(افسانے دیوناگری میں)
۲۔	غلام گردش	(افسانے)
۳۔	ایک خراب کہانی	(افسانے)
۴۔	فکشن کی تنقید: مزید مباحث	(تنقید)
۵۔	ترقی پسند ادب	(مقالات)
۶۔	بصیرت و بصارت	(مقالات)
۷۔	مقالاتِ ڈاکٹر عبد العلیم	(ترتیب و ترجمہ)
۸۔	اسلامیات از ڈاکٹر عبد العلیم	(ترتیب و ترجمہ)
۹۔	جو یاد رہا	(خود نوشت)
۱۰۔	اردو صحافت: چند گوشے	(مضامین)

4407

اعتذار

افسانوی مجموعہ ''جینے والے'' شائع ہوا تو ایک ممتاز افسانہ نگار نے، جو میرے بے حد عزیز دوست بھی ہیں، مجھے لکھا ''بہت بڑے افسانہ نگار ہو، کسی نقاد کی رائے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔''

''جینے والے'' میں نہ کسی نقاد کا مقدمہ ہے نہ فلیپ یا کتاب کی پشت پر کسی کی رائے، لیکن اس کا سبب وہ نہیں جو میرے عزیز دوست نے سمجھا بلکہ یہ ہے کہ میرے خیال میں پہلے افسانوی مجموعے میں چوں کہ مجھے خود کو متعارف کرانا تھا اس لیے شائد یہ سب کچھ ضروری تھا۔ لیکن ''جینے والے'' کے ساتھ اس قسم کی کوئی مجبوری نہ تھی۔ قاری افسانوی مجموعہ ''سب سے چھوٹا غم'' پڑھ کر افسانوں اور تخلیق کار کے بارے میں اچھی یا بری رائے قائم کر چکا تھا اور اب وہ تخلیق اور اپنے درمیان کسی کی مداخلت نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کے سامنے صرف افسانے پیش کیے گئے تھے۔

بعض لوگوں کے خیال میں ''فکشن کی تنقید۔ چند مباحث'' کا جھکاؤ شمس الرحمن فاروقی کی طرف ہے اور بعض دوسرے اسے فاروقی کے نظریات کی مکمل اور مدلل تردید سمجھتے ہیں، جب کہ یہ افسانے کے چند مسائل کا کھلے دل و دماغ سے ایک مطالعہ ہے اور بس۔ ان مضامین کے قضایا اور افسانوں کے تجزیوں پر موافق اور مخالف رائیں آچکی تھیں لیکن میں کتاب پر کوئی لیبل نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ یہ کتاب بھی ''بیساکھیوں'' سے محروم رہ گئی۔

زیر نظر کتاب کی اشاعت کی نوبت آئی تو چند خاکوں کے بارے میں جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر محمد حسن، شمس الرحمن فاروقی اور کئی دوسرے ادیبوں کی رائیں موجود تھیں۔ ایک بار تو جی للچایا کہ ان سے کتاب کو سجادوں، لیکن ایک اور خیال بھی آیا۔

ان میں سے بیشتر رائیں خطوط کی شکل میں تھیں اور خطوط میں عام طور سے فضائل ہی فضائل بیان ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح ظاہر کی جانے والی رائے، چاہے وہ کتنی ہی عالمانہ اور نیک نیتی پر مبنی کیوں نہ ہو، دوستداری ہی کی ایک شکل تصور کی جاتی ہے۔ جی نہ چاہا کہ ان نامور ادیبوں کو کسی مشکل میں ڈالوں۔

چنانچہ ''کھلی کتاب'' بھی نامور ادیبوں کے ''سہارے'' کے بغیر ہی پیش خدمت ہے۔

عابد سہیل

DESIGNED BY FAISAL WAQAR PRINTED AT : KAKORI OFFSET PRESS, LKO. PH. : 2229816